کشمیر میں اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

کشمیر میں اردو

(پہلا حصہ — پس منظر)

پروفیسر عبدالقادر سروری

ترتیب، تہذیب و حواشی

محمد یوسف ٹینگ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن بارہ سال قبل شایع ہوا اور اس سے کشمیر کے دبستانِ اردو کی روایت مستحکم بھی ہوئی اور روشن بھی۔ جب سے بیکرہ حالات نے ملک میں اردو کے چراغوں کی لو کچھ اور دھیمی کر دی ہے اور ریاست کے کچھ حصوں میں بھی اس کی تدریس سِمٹ گئی ہے اس لئے اس کتاب کی تاریخی اہمیت بڑھ گئی ہے جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے چلن کے عظیم نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصوں کی جو اردو کے تذکرے کا بلا واسطہ اظہار ہیں۔ دوسرے ایڈیشن کب کے شایع ہو کر اب ختم ہونے کے قریب ہیں۔ لیکن ابتدائی حصّے کی نوبت اب آئی ہے۔ یہ حصّہ ریاست میں اردو کی کہانی کا راست اظہار پیش نہیں کرتا لیکن یہ قالین کے اُس حاشیئے کی حیثیت رکھتا ہے جس کی حدود میں اُس کے نقش اور گل بوٹے نکھرتے اور سنورتے ہیں۔ اردو زمین سے نہیں اُگی جس کا ثبوت اسمیں مٹی کی بو باس سے شرابور لوک گیتوں کی عدم موجودگی ہے۔ جیسا کہ فیض احمد فیضؔ

مرحوم نے راقم الحروف سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ اردو میں کسان کے پسینے کی بو نہیں مگر بیگم کے عطرِ حنائی کی خوشبو ضرور موجود ہے یہ اُردو کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ بہر حال یہ بیل برصغیر کی دوسری زبانوں اور کچھ بیرونی زبانوں کے سہارے ہی پنپی اور پروان چڑھی یہی پس منظر کشمیر میں اُردو کے تذکرے کے ساتھ اس تہذیبی تذکرے کا جواز بھی ہے سونے پر سہاگہ یہ کہ یہ حصہ کشمیر کے تہذیبی ارتقا اور اس کی لسانی کثرت کا ایک ایسا تذکرہ ہے جسے اپنی خود مختار حیثیت میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اور اردو میں کشمیر سے متعلق اس موضوع پر شاید ہی اور کوئی کتاب میسّر ہو کشمیر اور اُردو کے تعلق سے حال ہی میں نئی معلومات سامنے آئی ہیں۔ راجگانِ جموّں نے اپنی دُھن میں جس ریاست کے چھار خانے جلدی جلدی میں جوڑ دیئے تھے۔ اس کی تہذیبی صورتِ حال سے ناواقف ہونے کے سبب انہوں نے لسانی تشدّد سے کام لینا چاہا لیکن حکمران گھرانے میں اقتدار کی رسہ کشی نے جب اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں پھینک دیا تو چند اُردو جاننے والے مُلازم پنجاب سے یہاں آ گئے۔ انہی میں سے ایک بھاگ رائے نے ۱۸۸۸ء کے قریب تقریباً بے خیالی میں سرکاری دستاویزات میں اُردو کا استعمال شروع کیا اور یہ ریاست کی لسانی صورتِ حال کو ایسا اُلٹ آ گیا کہ اردو ریاست کے سرکاری اور علمی ادب پر ایک میگھ دوت کی طرح رواں دواں ہو گئی۔ حالانکہ جموّں میں سرکاری عندلیے کی مزاحمت کے پھر

بھی موجود تھے اور کشمیر کے مسلمانوں نے فارسی کو جو چھ سو سال سے اُن کی سرکاری ثقافتی اور مذہبی ترجمان تھی، ترک ہوتے دیکھ کر شور مچایا۔ چنانچہ کشمیر کے خاصان دربار کی رہنمائی میں حکومت کو باقاعدہ عرضی واگذار کی گئی کہ فارسی کی بجائے اردو جیسی نوخیز زبان کو منہ نہ لگایا جائے۔ لیکن وہ ساز گار تواریخی قوتوں کے بادبانوں پر تیر رہی تھی۔ اس لئے حکمران بھی ہاتھ ملتے رہ گئے اور قدامت پسند بھی بے بس ہو گئے اور بیسویں صدی جموں و کشمیر میں اردو کے محاورے میں ہی وارد ہوئی اور پہچانی گئی۔ افسوس ہے کہ تواریخ کی جدلیاتی قوتوں نے اپنے پیمان اتنی جلدی توڑ دئے اور اردو لگ بھگ وادی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو کا یہ سمٹاؤ خود ریاست کے تہذیبی انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ ریاست کی تہذیبی اور سیاسی وحدت اردو کی ریشمی ڈور کے بغیر قایم رہنے کا امکان کم ہے اور اس پس منظر میں اس کتاب کا پیغام اونچی آواز میں بولتا ہے۔

جموں۔
۳ فروری سنہ ۱۹۹۳ء

محمد یوسف ٹینگ
سیکرٹری

حرفِ آغاز

اُردو اور کشمیر کا رِشتہ یوں تو رسمی طور سوا سو سال سے زیادہ پُرانا نہیں ہے۔ لیکن اردو جس تہذیبی لہر کی کوکھ میں پلی اور پنپی اور پھر جس کے شانے پر سوار ہو کر صفت جام پھری، اُس سے کشمیر کی اُنس و آشنائی صدیوں کے عرصے کو محیط ہے۔ اس رشتے کی گرہیں کھولنے کی جستہ جستہ کوششیں اگرچہ وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، لیکن اس موضوع پر سچے معنوں پر دادِ سخن اُس شخص کو دینا پڑی۔ جو کشمیر سے ہزاروں میل دور جزیرہ نمائے دکن کی سنگلاخ چٹانوں میں پلا بڑھا۔ پروفیسر عبد القادر سروری کی کشمیر سے نسبت ان کے وجود معنوی کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے۔ اُن کے آبا و اجداد صدیوں پہلے کشمیر سے ہی حیدر آباد دکن جا کر آباد ہو گئے تھے۔ خود سروری صاحب اِس صدی کے وسط میں وہیں سے اُردو کے ایک مقتدر اور معتبر محقق اور نقاد کی حیثیت سے ابھرے۔ حیدر آباد کے ہی ایک اور نامور اردو ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی طرح وہ بھی جامعۂ عثمانیہ سے جامعۂ کشمیر میں اُردو شعبے کے صدر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اور یہاں بھی ان کے قلم کا تیشہ اندھیری وادیوں میں چراغاں کرنے لگا۔ انہوں نے "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" اور "کشمیر کے دو بھائی دو اردو ادیب" جیسی کتابیں لکھیں۔ لیکن کشمیر میں اُن کے زمانۂ قیام کا شاہکار زیر نظر کتاب ہے۔ "کشمیر میں اُردو" اگرچہ وہ کئی برسوں سے کام کر رہے تھے۔ لیکن یہ ۱۹۷۰ء میں ہی تکمیل کو پہنچی۔ کلچرل اکادمی نے اُن سے اس معرکۃ الآراء کتاب کا مسودہ حاصل کیا ہی تھا کہ انہیں ۱۹۷۱ء میں قضا کا بلاوا

بھی موجود تھے اور کشمیر کے مسلمانوں نے فارسی کو جو چھ سو سال سے اُن کی سرکاری ثقافتی اور مذہبی ترجمان تھی، ترک ہوتے دیکھ کر شور مچایا۔ چنانچہ کشمیر کے خاصان دربار کی رہنمائی میں حکومت کو باقاعدہ عرضی واگذار کی گئی کہ فارسی کی بجائے اردو جیسی نوخیز زبان کو منہ نہ لگایا جائے لیکن وہ ساز گار تواریخی قوتوں کے بادبانوں پر تیر رہی تھی۔ اس لئے حکمران بھی ہاتھ ملتے رہ گئے اور قدامت پسند بھی بے بس ہو گئے اور بیسویں صدی جموں و کشمیر میں اردو کے محاورے میں ہی وارد ہوئی اور پہچانی گئی۔ افسوس ہے کہ تواریخ کی جدلیاتی قوتوں نے اپنے پیمان اتنی جلدی توڑ دئے اور اردو لگ بھگ وادی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو کا یہ سمٹاؤ خود ریاست کے تہذیبی انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ ریاست کی تہذیبی اور سیاسی وحدت اردو کی ریشمی ڈور کے بغیر قایم رہنے کا امکان کم ہے اور اس پس منظر میں اس کتاب کا پیغام اونچی آواز میں بولتا ہے۔

جموں۔ **محمد یوسف ٹینگ**

۲ر فروری ۱۹۹۳ء سیکرٹری

ہ

حرفِ آغاز

اُردو اور کشمیر کا رشتہ یوں تو رسمی طور سو سوا سو سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے، لیکن اردو جس تہذیبی لہر کی کوکھ میں پلی اور پنپی اور پھر جس کے شانے پر سوار ہو کر صفت جام پھری، اُس سے کشمیر کی اُنس و آشنائی صدیوں کے عرصے کو محیط ہے۔ اس رشتے کی گرہیں کھولنے کی جستہ جستہ کوششیں اگرچہ وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، لیکن اس موضوع پر سچے معنوں پر دادِ سخن اُس شخص کو دینا پڑی۔ جو کشمیر سے ہزاروں میل دور جزیرہ نمائے دکن کی سنگلاخ چٹانوں میں پلا بڑھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی کشمیر سے نسبت ان کے وجود معنوی کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے۔ اُن کے آبا واجداد صدیوں پہلے کشمیر سے ہی حیدرآباد دکن جاکر آباد ہو گئے تھے۔ خود سروری صاحب اِس صدی کے وسط میں وہیں سے اُردو کے ایک مقتدر اور معتبر محقق اور ناقد کی حیثیت سے ابھرے۔ حیدرآباد کے ہی ایک اور نامور اردو ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی طرح وہ بھی جامعۂ عثمانیہ سے جامعۂ کشمیر میں اُردو شعبے کے صدر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اور یہاں بھی ان کے قلم کا تیشہ اندھیری وادیوں میں چراغاں کرنے لگا۔ انہوں نے "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" اور "کشمیر کے دو بھائی دو اردو ادیب" جیسی کتابیں لکھیں۔ لیکن کشمیر میں اُن کے زمانۂ قیام کا شاہکار زیر نظر کتاب ہے۔ "کشمیر میں اردو" پر اگرچہ وہ کئی برس سے کام کر رہے تھے، لیکن یہ ۱۹۷۰ء میں ہی تکمیل کو پہونچی۔ کلچرل اکادمی نے اُن سے اِس معرکتہ الآراء کتاب کا مسودہ حاصل کیا ہی تھا کہ انہیں ۱۹۷۱ء میں قضا کا بلاوا

بھی موجود تھے اور کشمیر کے مسلمانوں نے فارسی کو جو چھ سو سال سے اُن کی سرکاری ثقافتی اور مذہبی ترجمان تھی، ترک ہوتے دیکھ کر شور مچایا۔ چنانچہ کشمیر کے خاصان دربار کی رہنمائی میں حکومت کو باقاعدہ عرضی واگذار کی گئی کہ فارسی کی جائے اُردو جیسی نوخیز زبان کو منہ نہ لگایا جائے لیکن وہ ساز گار تواریخی قوتوں کے بادبانوں پر تیر رہی تھی۔ اس لئے حکمران بھی ہاتھ ملتے رہ گئے اور قدامت پسند بھی بے بس ہو گئے اور بیسویں صدی جموّں و کشمیر میں اُردو کے محاورے میں ہی وارد ہوئی اور پہچانی گئی۔ افسوس ہے کہ تواریخ کی جدلیاتی قوتوں نے اپنے پیمان اتنی جلدی توڑ دئے اور اُردو لگ بھگ وادی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ اُردو کا یہ سمٹاؤ خود ریاست کے تہذیبی انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ ریاست کی تہذیبی اور سیاسی وحدت اُردو کی ریشمی ڈور کے بغیر قایم رہنے کا امکان کم ہے اور اس پس منظر میں اس کتاب کا پیغام اونچی آواز میں بولتا ہے۔

جموّں۔
۳ر فروری ۱۹۹۳ء

محمد یوسف ٹینگ
سیکرٹری

حرفِ آغاز

اُردو اور کشمیر کا رشتہ یوں تو رسمی طور سو، سوا سو سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ لیکن اردو جس تہذیبی لہر کی کوکھ میں پلی اور پنپی اور پھر جس کے شانے پر سوار ہو کر صفت جام پھری، اُس سے کشمیر کی اُنس و آشنائی صدیوں کے عرصے کو محیط ہے۔ اس رشتے کی گرہیں کھولنے کی جستہ جستہ کوششیں اگرچہ وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، لیکن اس موضوع پر سچے معنوں پر دادِ سخن اُس شخص کو دینا پڑی۔ جو کشمیر سے ہزاروں میل دور جزیرہ نمائے دکن کی سنگلاخ چٹانوں میں پلا بڑھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی کشمیر سے نسبت ان کے وجود معنوی کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے۔ اُن کے آبا و اجداد صدیوں پہلے کشمیر سے ہی حیدرآباد دکن جا کر آباد ہو گئے تھے۔ خود سروری صاحب اِس صدی کے وسط میں وہیں سے اُردو کے ایک مقتدر اور معتبر مُحقّق اور ناقد کی حیثیت سے ابھرے۔ حیدرآباد کے ہی ایک اور نامور اردو ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی طرح وہ بھی جامعہ عثمانیہ سے جامعہ کشمیر میں اُردو شعبے کے صدر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اور یہاں بھی ان کے قلم کا تیشہ اندھیری وادیوں میں چراغاں کرنے لگا۔ انہوں نے "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" اور "کشمیر کے دُو بھائی دو اُردو ادیب" جیسی کتابیں لکھیں۔ لیکن کشمیر میں اُن کے زمانۂ قیام کا شاہکار زیرِ نظر کتاب ہے۔ "کشمیر میں اُردو" پر اگرچہ وہ کئی برس سے کام کر رہے تھے، لیکن یہ ۱۹۷۰ء میں ہی تکمیل کو پہونچی۔ کلچرل اکادمی نے اُن سے اِس معرکتہ الآراء کتاب کا مسودہ حاصل کیا ہی تھا کہ انہیں ۱۹۷۱ء میں قضا کا بلاوا

آگیا۔ اور یہ بھی ڈاکٹر زور سے اپنی ہم نوائی کی روایت برقرار رکھتے ہوئے کشمیر کی شفیق آغوش میں

سما گئے۔ ع

پہونچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

سروری صاحب اِس کتاب کی تکمیل کے بعد بھی اپنی جستجو اور آرزو کے ہاتھوں ایک سچے محقق کی طرح ناصبور رہتے۔ اور اسمیں برابر اضافے اور درستی کا عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔ اُن کا بڑا اصرار تھا کہ وہ کاپیوں کی درستی اور تصحیح اپنی نگرانی میں کرائیں گے اور اس کے پیچھے یہی جذبہ تھا کہ آخر وقت تک وہ تازہ بتازہ معاملات اور اخذ استفادے کے نتائج کو متن میں پیوست کر سکیں۔ لیکن ع ساتھ میرے رہ گئی ایک میری آرزو۔ گذشتہ کئی سال کے دوران اس موضوع پر بہت سا کام ہوا ہے۔ جستہ جستہ مضامین کے علاوہ ترقی اردو بورڈ، لاہور نے حبیب کیسفوی کی ایک ضخیم کتاب "کشمیر میں اردو" بھی ۱۹۷۹ء میں شایع کی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اسمیں بہت سی اہم معلومات اکٹھا کی گئی ہیں، لیکن کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اصلی کنٹرول کی لکیر کے اِس پار اردو کے کوائف کے متعلق کیسفوی صاحب کے بیانات محلِ نظر اور بہت سی صورتوں میں تسامح سے بھرپور ہیں۔ مثلاً ہماری کلچرل اکادمی سے ہی متعلق اُن کا یہ بیان کہ یہ اکادمی جواہر لال یونیورسٹی کی ایک ذیلی شاخ کسقدر بعید از حقیقت ہے۔ اِس بات کے ذکر سے اُن کی کتاب پر انگشت نمائی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اُن کی کتاب کی ترتیب و تکمیل میں انہیں کسقدر دشواریاں درپیش رہی ہونگی۔ کیسفوی کی کتاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب دستیاب نہیں ہے"۔ میرے خیال میں سروری صاحب کی کتاب کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ کو اپنی اِس رائے پر یقیناً نظرِ ثانی کرنا پڑیگی۔ کیونکہ سروری صاحب کی کتاب اس موضوع پر ہر لحاظ سے ایک اگلے قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔

کشمیر اور اردو کے تعلق پر جب جب بھی بات کی جائے گی تو حکیم مومن خان مومنؔ،

پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نارائن چکبست، علامہ سر محمد اقبال، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور دیگر مشاہیرین اُردو کے ساتھ ساتھ آغا حشر کاشمیری کے نام بھی لب پر آئیں گے۔ اُردو ادب کی عمارت کے یہ ستون کشمیر سے گہری نسبت رکھتے ہیں اور انہوں نے بیک وقت اپنی کشمیری نژاد اور اپنی اُردو نوازی پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات بڑی مناسب ہے کہ سروری صاحب کی اس کتاب کو آغا حشر کاشمیری کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے موقعے پر شائع کیا جا رہا ہے۔ حشر صرف ایک عظیم ڈراما نگار ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک خوش بیان اُردو شاعر بھی تھے۔ اور غزل کے ایسے شعر نکال سکتے تھے۔

چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی
خوشبو اڑا کے لے گئی گیسوئے یار کی

سروری صاحب کی وفات کے بعد یہ بار امانت بہت دنوں تک ہمارے آرکائیوز میں ہی پڑا رہا۔ لیکن اس دوران ہم نے بہت سے صاحبان فکر و نظر سے رجوع کر لیا۔ اور اُن سے مشورے حاصل کئے۔ چنانچہ اس جلد کے مختلف حصوں کی نظر ثانی کے سلسلے میں ہم نے پروفیسر محی الدین حاجنی، ڈاکٹر شمس الدین احمد، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، قاضی غلام محمد صاحب، پروفیسر سیوا سنگھ، راقم الحروف اور شری جتیندر شرما سے رجوع کیا اور جہاں جہاں واقعاتی غلطیاں نظر آئیں یا جن مقامات پر بہتر معلومات حاصل ہوئیں، اُنہیں سروری صاحب کے اصل مسودے کے متن سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بغیر حاشیوں کی صورت میں پیش کر دیا۔ اس جلد کے علاوہ کتاب کی دو اور جلدیں بھی اگلے سال شائع کی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ قارئین دیکھ لیں گے، یہ جلد اصل موضوع کے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعے سے کشمیر میں اُردو کی نشو و نما کے سلسلے میں تہذیبی اور لسانی تناظر ذہن میں آتا ہے۔ دو اور جلدیں اس افسانے کا تکملہ ہیں اور وہاں زیادہ تفصیل اور گہرائی سے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے ادبیات کشمیر اور اردو اور کشمیر سے

متعلق ایسی بہت سے بھول بھلیاں روشن ہو جائیں گی . جن سے اردو زبان کے قاری کی نگاہیں آشنا نہیں ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ

جموں ۔ ۶ فروری سنہ ۱۹۸۱ء

طبعی، سماجی اور تہذیبی

ریاست جموں وکشمیر وسیع پہاڑی علاقہ ہے جو ۸۴،۴۷۱[۱] مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کو بعض وقت سہولت کی خاطر محض کشمیر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے لیکن اس میں جموں، کشمیر، لداخ، بلتستان، گلگت، ہُنزا، اور نگر کے علاقے شامل ہیں۔ ریاست کی سرحد جنوب میں پنجاب کے وسیع میدان کے اختتام سے شروع ہوتی ہے اور شمال میں قراقرم کے سلسلے تک پھیلی ہوئی ہے۔ ریاست کی سرحدیں ممالک بالترتیب روس، چین، افغانستان اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ اس علاقے میں شمالی ہند کی عظیم ندیوں چناب اور جہلم کی بالائی اور سندھ کی وسطی وادیاں شامل ہیں۔ کشمیر کی وادی وسطِ ایشیا کی تجارتی گزرگاہ پر واقع ہے اور ایشیا میں اپنے مرکزی محلِ وقوع کی وجہ سے زمانۂ قدیم سے وسط ایشیا سے ہندوستان جانے والے تجارتی کاروان کے پڑاؤ کا مقام بنی رہی ہے۔

ریاست کے مختلف خطوں کی جغرافیائی خصوصیات بھی مختلف ہیں۔ پنجاب کے شمال سے جو سطح علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی جغرافیائی خصوصیات پنجاب ہی سے ملتی جلتی ہیں۔ اس کے ختم پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ یہ پہاڑیاں

[۱] کل ۸۴،۴۷۱ مربع میل ہے۔

وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہیں اور یہ علاقہ "بیرونی پہاڑیوں کے علاقے" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پہاڑیاں جو دو ہزار سے لے کر چار ہزار فٹ کی اونچائی رکھتی ہیں ایک دوسرے سے متوازی چلتی ہیں۔ اس علاقے کے مشرق میں دریائے راوی بہتا ہے اور مغربی علاقے کو دریائے جہلم سیراب کرتا ہے۔

جموں، جو ریاست کی سرمائی راجدھانی ہے، دریائے توی سے شروع ہونے والی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ دریائے چناب، پہاڑیوں سے نکل کر اکھنور کے قریب میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے اور ضلع جموں سے بہتا ہوا پنجاب میں داخل ہو جاتا ہے۔ ضلع جموں کے علاوہ میرپور بھی اس علاقے میں شامل ہے۔ شہر جموں جو ۱۰۳۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے، توی ندی کے کنارے آباد ہے اور اپنے مندروں کی وجہ سے رونق رکھتا ہے۔ ان میں سے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ کا بنوایا ہوا رگھوناتھ مندر، بہت شاندار ہے، جس کا گنبد اور کلس سونے کا بنا ہوا ہے۔ اس علاقے میں بسوہلی رام کوٹ اور رام نگر چناب کے مشرق میں اور اکھنور اور بھمبر مغرب میں اہم شہر ہیں۔ مغلیہ دور میں بھمبر شاہی قافلے کی ایک اہم منزل تھی۔ جہاں آج ایک سرائے، مغل حکمرانوں کی بنوائی ہوئی موجود ہے۔ راجوری کشمیر کے سفر کی راہ میں ایک اور منزل تھی اسلئے یہاں بھی ایک ڈاک بنگلہ ہے۔[1]

یہ علاقہ گرم ہے اور اپریل سے جون تک یہاں اچھی گرمی پڑتی ہے۔ جولائی سے ستمبر تک بارش کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور اکتوبر سے مارچ تک سرد موسم ہوتا ہے۔ اس علاقے میں بلندی کے لحاظ سے پیداوار کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔[2] دو ہزار فٹ سے نیچے وہی پیداوار ہوتی ہے جو پنجاب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے۔ دامن کوہ میں روئی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مکئی، گیہوں اور جو

۱۔ فاضل مصنف کا یہ بیان تو غلط ہے [illegible] تمام پنجاب میں کوئی [illegible] نہیں ہوتی۔

بھی بہتات سے پیدا ہوتا ہے۔ پہاڑیوں پر گھنے جنگل ہیں جن میں دیودار اور چیڑ کثرت سے اُگتے ہیں۔

اس علاقے کے مقابلے میں درمیانی پہاڑی علاقہ ہے۔ جس میں چار ہزار سے لے کر بارہ ہزار تک بلند پہاڑ واقع ہیں۔ اس علاقے میں بھدرواہ، کشتواڑ اور پاڈر کے علاقے شامل ہیں۔ اس علاقے کے جنگلوں میں سلور فر، دیودار، صنوبر، شاہ بلوط اور چیڑ کے درختوں کی کثرت ہے۔ زراعت صرف نشیبی علاقوں میں ہوسکتی ہے اور مکئی، چاول، باجرہ، جَو اور گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ اس علاقے کے پہاڑوں پر برف گرتی ہے اور دیر تک باقی رہتی ہے۔ ان پہاڑوں میں بھدرواہ کا علاقہ بہت دلچسپ ہے اور ۵۴۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کے گھنے جنگل دلچسپ ہیں۔ اس علاقے میں میوے جیسے سیب، ناشپاتی، توت، خوبانی اور چیری کثرت سے ہوتا ہے۔

کشتواڑ دوسرا علاقہ ہے، جو ۵۴۰۰ فٹ بلند سطح مرتفع ہے اور یہاں کے پہاڑ، دیودار، چیڑ اور شاہ بلوط کی وجہ سے دلکش اور شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں آبشار ہیں، جن کی وجہ سے سارا علاقہ دلکش بن گیا ہے۔ یہاں طرح طرح کے پھل جیسے آلو بخارا، سیب، ناشپاتی، چیری، انگور، بہی وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ بعض حصّوں میں زعفران کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ لیکن یہ کشمیر کے زعفران کی طرح اعلیٰ قسم کا نہیں ہوتا۔

پاڈر کشتواڑ سے قریب ایک چھوٹی سی وادی ہے جہاں دھاتیں، فیروزہ، بلور کی کئی اقسام دستیاب ہوتے ہیں۔ وسطی پہاڑیوں کے علاقے سے آگے بڑھ کر ہم سربفلک پہاڑوں کے خطّے میں پہنچتے ہیں جن کے درمیان وادیٔ جنت نظیر کشمیر طاس کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ پیر پنجال سلسلہ کوہ سے بات سما

دلکش حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ پیر پنچال کی اونچائی آٹھ ہزار سے لے کر پندرہ ہزار فٹ تک ہے ان ہی پہاڑوں میں جھیلِ کوثر ناگ ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ۱۵۵۲۴ فٹ پر تاتا کوٹی اور سب سے اونچا اویلیش تھونگ ہے جسے "سن سیٹ پیک" بھی کہتے ہیں۔ خود وادیٔ کشمیر ہمالیہ کی گود میں اوسطاً چھ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ وادی کا طول ۸۴ میل اور عرض ۲۵ میل تک ہے۔ اس کے شمال مشرق، اور مغرب میں قطار اندر قطار کوہستانی سلسلوں نے اسے بیرونی دنیا سے منقطع کر رکھا ہے اور جنوب میں پنجاب کی طرف ۵۰ تا ۷۵ میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی پہاڑیوں نے اسے ادھر سے بھی منقطع کر دیا ہے۔

جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ وادی پہلے ایک جھیل تھی جسے ستی سر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن اس جھیل کے پیدا ہونے اور پھر خشک ہونے کی توجیہ ماہرینِ ارضیات کے نقطۂ خیال سے، زلزلے ہوئے جو اس علاقے میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ کشمیر کے نام کا اشتقاق سنسکرت کے علماء کے مطابق سنسکرت "کا" (پانی) اور "شیمیرا" (خشک ہوا) سے مرکب ہے لیکن روایت اسے کشیپ رشی کے نام پر کشیپ پورہ اور کشیپ مارا سے ماخوذ بتاتی ہے۔ وادی جن پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے وہ بلندی اور پھیلاؤ کے لحاظ سے شکل و شباہت میں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ شمال میں برف سے ڈھکتے ہوئے پہاڑوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے جو ننگا پربت کی صورت میں ۲۶۱۸۲ فٹ کی بلندی تک پہنچتا ہے۔ مشرق میں کوہ ہرمکھ کی بلندی ۱۶۹۰۲ فٹ تک پہنچتی ہے جنوب میں مہادیو کی چوٹی اور گاشہ براری کا سلسلہ ۱۴۸۰۰ فٹ ہے۔ جس میں امرناتھ ۱۷۳۲۱ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اسی سمت میں پیر پنچال کا سلسلہ

بے آب وگیاہ سطحِ مرتفع بھی ہیں۔ جو "کریوہ" کہلاتی ہیں۔

کشمیر کو جھیلوں، دریاؤں، آبشاروں اور پھولوں کی سرزمین بھی کہا گیا ہے۔ اس کے میٹھے پانی کی جھیلیں، ڈل، وُلر اور مانسبل سارے عالم کا عجوبہ ہیں۔ سری نگر میں ڈل کا ایک مصور حصّہ پہاڑوں کے دِلکش پس منظر میں، جو نگین کے نام سے موسوم ہے تھکے ماندے ذہنوں کے لئے ایک خاموش اور حسین پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر سال موسم بہار میں ہند اور بیرونِ ہند سے سیاح آکر یہاں ہاؤس بوٹ میں قیام کرتے ہیں۔ یہاں کے مناظر کا حُسن تحریر کے احاطے میں مشکل سے آسکتا ہے۔

وُلر برصغیر ہند میں میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ ڈل شہر سری نگر کا حُسن اس کی زینت اور دِلکشی کا مرکز ہے۔ مانس بل وادی کی عمیق ترین جھیل ہے۔ ان جھیلوں کے علاوہ کئی پہاڑی جھیلیں بھی ہیں جو برفانی رود (گلیشیر) سے پانی رِسنے سے بن گئی ہیں۔

برفانی رود سے بنی ہوئی جھیلوں میں کوہِ ہرمکھ میں واقع گنگابل، لول گول، سار بل، اور پیر پنچال میں کوثر ناگ، اور وادی لدر میں کولہائی اور امرناتھ کے راستے میں شیش ناگ، اسی طرح کی مشہور جھیلیں ہیں۔

دریائے جہلم جو چشمہ ویری ناگ سے نکلتا ہے، کم و بیش وادی کے آرپار بہتا ہے اور شہر کے حُسن کا بھی باعث ہے۔ جہلم اور ڈل میں ہزار ہا شکارے ادھر سے اُدھر گھومتے دِکھائی دیتے ہیں اور لوگوں کے لئے نقل و حمل کے ذریعے کا کام بھی دیتے ہیں۔ بڑی کشتیاں سامان کے لانے لے جانے کے کام آتی ہیں۔ اور خاص سری نگر شہر میں سجے سجائے ہاؤس بوٹ کی قطاریں، بڑا ہی حسین منظر پیش کرتی ہیں۔ باغات اور خاص طور پر مغل باغات اپنی نوعیت کے خاص باغ ہیں جو کشمیر کی خصوصیات میں سے ہیں۔ خاص شہر سری نگر میں مشہور باغات، باغ شالیمار، باغ نشاط،

چشمہ شاہی، اپنی تعمیر کے لحاظ سے ایک انوکھی شان رکھتے ہیں۔ یہ باغات پہاڑوں کی ڈھلوانوں، کو کاٹ کر اور مسطح کر کے طبقوں کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اہلِ کشمیر اور کشمیر سے باہر آنے والے سیاحوں کے لئے یہ تفریح کے بڑے مرکز ہیں۔ یہ تو مشہور باغات ہیں۔ ان کے علاوہ بھی وادی میں سینکڑوں حسین باغ ہیں۔ بلکہ ہر محلہ ایک باغ تھا۔ اسی لئے اکثر محلوں کے نام میں "باغ" کا جُز آج بھی باقی رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر وزیر باغ، حضوری باغ، باغِ وزیر خاں، راج باغ، مگھر مل باغ، باغِ دلاور خان، غرض ایسے ہی کتنے اور باغ ہیں۔

سری نگر سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر، وہ پہاڑی تفریح گاہیں ہیں۔ جن کا حُسن ساری دُنیا سے یاتریوں کو یہاں کھینچ کر بلاتا ہے۔ پہلگام، گلمرگ، ڈُک سُم، ہارون، ویرناگ، وادیِ لولاب، سونہ مرگ، کوکر ناگ، یوس مرگ۔ غرض کتنے ہی ایسے مرغزار اور چشمہ سار ہیں، جہاں لوگ تفریح اور قیام کے لئے جاتے ہیں۔

ریاست کا تیسرا جغرافیائی علاقہ لداخ، گلگت، بلتستان، اور دردستان کا ہے۔ یہ سارا علاقہ پہاڑی ہے۔ اس علاقے میں خطّہ منجمدہ کی سی سردی پڑتی ہے۔ ناموافق آب و ہوا کی وجہ سے یہاں پیداوار اور آبادی بھی بہت کم ہے۔ پہاڑوں نے اس علاقہ کو ریاست کے دوسرے حصّوں سے منقطع کر دیا ہے لداخ کشمیر کے شمال میں ۱۲۰۰۰ سے لے کر ۱۵۰۰۰ فٹ تک بلند ہے۔ یہاں کے کچھ پہاڑوں کی بلندی ۲۰۰۰۰ سے ۲۵۰۰۰ فٹ تک ہے۔ قراقرم سلسلۂ کوہ لداخ کے شمال میں ہے اور جنوب میں لداخ اور زانسکار کے سلسلے واقع ہیں۔ ان دونوں کے درمیان دریائے سندھ بہتا ہے۔ قراقرم کی بلند ترین چوٹی گاڈون آسٹن ۲۸۲۶۵ فٹ بلند ہے۔

لداخ کے موسم بہت تکلیف دہ ہیں۔ راتیں حد سے زیادہ سرد اور دن

بہت گرم ہوتے ہیں۔ بارش زیادہ نہیں ہوتی اور پہاڑوں پر برف بھی برائے نام ہوتی ہے۔ پہاڑوں میں کچھ وادیاں شاداب بھی ہیں جہاں جو گیہوں، ناشپاتی، گرم، سرسوں، بین، پیاز وغیرہ کی زراعت ہوتی ہے۔ بعض علاقوں میں سیب اور خوبانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیہہ جو لداخ کا دارالحکومت ہے، وسط ایشیا اور ہند کے درمیان تجارتی اشیاء کے تبادلے کا مرکز رہا ہے۔

بلتستان، سندھ کی وادی میں ۶۵۲۲ مربع میل پر پھیلا ہوا علاقہ ہے۔ اس کے شمال میں قراقرم، مشرق میں لداخ کا سلسلہ جنوب میں ہمالیہ اور مغرب میں دردستان واقع ہے۔

شگر اور اسکردو کافی آباد ہیں۔ اسکردو بلتستان کا صدر مقام ہے۔ اور عموماً یہ سارا علاقہ اسی نام سے موسوم ہے۔ اس علاقے میں زراعت کے قابل زمین بہت کم ہے۔ کہیں کہیں پھل، خاص طور پر انگور، تربوز، زیرہ اور خوبانی کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ علاقہ ہمالیائی علاقوں کی طرح حسین ہے۔ شمالی پہاڑوں میں سے بعض دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ہیں۔

دردستان شمال میں قراقرم تک پھیلا ہوا ہے جس میں گلگت، ہُنزا، نگر، چلاس، یاسین، پُنیال، گھیر زد، اِشکومان اور کوہ شامل ہیں۔ چترال کا علاقہ کسی زمانے میں ریاست کا باجگذار تھا۔ گلگت، سری نگر سے ۲۲۳ میل کے فاصلے پر ہے جس کا راستہ ویران اور بے آب وگیاہ ہے۔ گلگت اس ویرانے میں ایک شاداب ٹاپو معلوم ہوتا ہے۔ ساری وادیٔ سندھ بنجر اور بے آب وگیاہ ہے۔ لنگر تھنگ کے میدان سولہ اور سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ تھوڑی بہت بارش جو اس علاقے میں ہوتی ہے، وہ نمکین جھیلوں میں بہ جاتی ہے۔

ریاست کے تین مُمیز علاقوں کے لحاظ سے، اس کی آبادی کے اجزاء میں

بھی وسیع تنوع پایا جاتا ہے۔ جموں کا علاقہ جو پنجاب کے میدانوں سے لے کر کشمیر کے پہاڑوں تک پھیلا ہوا، ڈوگرہ قوم کا مسکن ہے۔ یہ عموماً سانولے، چھریرے بدن کے متوسط قد و قامت کے لوگ ہیں۔ اور راجپوتوں کی پہاڑی شاخ کہلاتے ہیں۔ یہ بہادر لوگ ہیں اور اپنی سخت کوشی کیلئے مشہور ہیں۔ ان کی کئی ذیلی ذاتیں ہیں اور ان میں ہندو بھی ہیں، اور مسلمان بھی۔ قدیم زمانے میں ان کا لباس شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور عمامہ ہوا کرتا تھا لیکن اب انگریزی پڑھے لکھے ڈوگرے کوٹ، پتلون پہننے لگے ہیں۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کھُلے رنگ کی ہوتی ہیں۔ عام لباس اور ان کا قدیم لباس جمپر اور چوڑی دار پاجامہ اور ڈوپٹہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب اکثر خواتین ساڑی اور بلاؤز پہننے لگی ہیں۔

ڈوگروں میں میگھ، چمیار، اور ڈومب، نیچ ذاتیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور سالہا سال سے یہ لوگ، سماجی اور مذہبی ناروا داری کا شکار رہے ہیں۔ اب تعصبات کچھ گھٹ رہے ہیں۔ پھر بھی روایت کا اثر ان کو ابھرنے نہیں دیتا۔ یہ محنتی لوگ ہیں اور عموماً زراعت ان کی معاش کا ذریعہ ہے۔ کچھ کفش دوزی اور خاکروبی کا کام بھی کرتے ہیں۔ ڈوگرہ مسلمان، زیادہ تر فوجی خدمات سے منسلک رہے ہیں۔

ڈوگروں میں بسنت، نوروز، لوہڑی اور دسہرہ عام تہوار ہیں۔ جنہیں سب ذوق و شوق اور بعض کو مذہبی عقیدتمندی کے ساتھ مناتے ہیں۔

جموں کے وسطی پہاڑی علاقے کے باشندے پہاڑی کہلاتے ہیں اور ان کا کام عموماً پہاڑوں کے دامن میں زراعت کرنا ہے۔ ان کی زبان پہاڑی کہلاتی ہے جو پنجابی، اردو یا ہندی کی ملی جلی بولی ہے۔ اس علاقے میں کشمیر کے لوگ بھی آکر آباد ہو گئے ہیں اور رفتہ رفتہ وہیں کے لوگوں کے رسم و رواج اختیار کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کی زبان مخلوط پہاڑی اور کشمیری ہے۔

ء ایک بڑا حصہ گوجری بھی بولتا ہے

گوجر، پہاڑی علاقے کے رہنے والوں میں سب سے زیادہ دلچسپ لوگ ہیں۔ یہ محنتی اور ایماندار ہوتے ہیں اور زیادہ تر مسلمان ہیں۔ دراز قد اور چھریرے بدن کے یہ لوگ بکریوں کے ریوڑ پالتے اور انہیں چراتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں اور ٹولیوں کی شکل میں اپنے ریوڑ اور گھوڑے لئے، جموں سے کشمیر کی طرف منتقل ہوتے نظر آتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ راجستھان سے آئے ہیں اور ان کی زبان گوجری راجستھانی ہی کی ایک شاخ سمجھی جاتی ہے۔

گوجر بہت مذہبی لوگ ہوتے ہیں، مرد لمبی عبا اور شلوار پہنتے ہیں اور سر پر عمامہ باندھتے ہیں اور داڑھی ان کی امتیازی نشانی ہے۔ عورتوں کا لباس پائجامہ اور لمبا چغہ سا ہوتا ہے۔ ان کے بال گوندھنے کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ وہ بالوں کو چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں بٹ کر گوندھتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی خوبصورتی میں مشہور ہیں۔

بعض مصنفین نے کشمیر کے لوگوں کو بنو اسرائیل کے "گم گشتہ" قبیلے کی اولاد بھی بتایا ہے۔

کشمیر کے ابتدائی باشندوں کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ دردستان اور لداخ سے آئے تھے۔ بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ کچھ لوگ ہندوستان سے بھی آئے تھے، لیکن کشمیر کی سردیوں کی تاب نہ لاکر، جموں چلے گئے، لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ ان آریاؤں کی نسل سے ہیں، جو وسطِ ایشیا یا روس کے گھاس کے میدانوں "سٹیپز" سے ہجرت کرکے، دریائے جیحون و سیحون کے ساتھ ساتھ خوقند کی سطح مرتفع کے اطراف میں بس گئے تھے۔ ان کی ایک شاخ ہندوکش کو پار کرکے وادی کابل پہنچی، جہاں سے کچھ قبائل پنجاب اور ہندوستان کے میدانوں میں بھی داخل ہوئے۔ آریوں کے ہند ایرانی گروہ میں اختلافات پیدا ہونے کے بعد ایک شاخ ایران سے دردستان چلی گئی تھی۔ اسی شاخ کے کچھ قبائل کشمیر بھی آئے

بعض محققین نے کشمیری زبان کو دردبولی کی ایک شاخ مان کر، اپنے نظریہ کی تائید پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قدیم یونانیوں نے اس سارے پہاڑی علاقہ کو جو ہندوکش اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان واقع ہے، درد علاقے میں شامل کیا تھا۔ اس علاقے کی زبان درد کہلاتی ہے۔

کشمیر کے باشندے اپنی شکل و شباہت، ساخت اور رنگ کے اعتبار سے ریاست بلکہ ہندوستان کے باشندوں میں ممیز ہیں۔ ان کے لباس، رسم و رواج اور عادات بھی دوسرے علاقوں کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ مرد عموماً دراز قد اور چھریرے بدن، کے گورے یا کھلے رنگ کے ہوتے ہیں اور ان کے خط و خال بھی دلکش ہوتے ہیں۔ کشمیر کی عورتوں کی تعریف میں، مختلف ملکوں کے شعرا رطب اللسان رہے ہیں۔

بعض مصنفین نے کشمیر کے لوگوں کو "بنو اسرائیل" کے "گم گشتہ" قبیلے سے بھی بتایا ہے اور ان کے خط و خال میں یہودیوں سے مشابہت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی تحقیق کی تائید میں بعض کشمیری ناموں کے ساتھ "جُو" کے احترامی لاحقے کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔

نیل مت پُران جو کشمیری پنڈتوں کی مقدس کتاب ہے اور راج ترنگنی کی بنیاد پر، ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ کشمیر کے باشندے، ان قدیم برہمنوں کی اولاد سے ہیں، جنہیں کشیپ ریشی نے وادی سے پانی کی نکاسی کے بعد ہندوستان سے بُلا کر یہاں آباد کیا تھا۔ اس سے قبل یہاں پشاچ اور یاشک آباد تھے۔ جو لوگوں کو دق کیا کرتے تھے۔ انہیں خوش رکھنے کے لئے ناگوں کے راجہ نیلا نے انہیں کھانا، کپڑا دینے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ آج تک کشمیری پنڈتوں میں یہ رسم جاری ہے کہ وہ پوسا کی تاریک رات کو کھچڑی پکا کر، نئے مٹی کے برتن میں گھر کے باہر رکھتے ہیں اور عقیدہ یہ ہے کہ راکھشس آ کر انہیں کھا لیتے ہیں۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ چونکہ کشمیری برہمن گوشت کھاتے ہیں۔ اس لئے خود انہیں کو پرانوں میں پشاچ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض مورخینِ کشمیر نے اسلامی عہد سے پہلے کے قبیلوں، نشاد، کَش، درد، بھُوت، ڈامر، تنترن وغیرہ کو اہلِ کشمیر اور برہمنوں کو ستایا کرتے تھے، ان سے مربوط کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

ہندوستانی علماء کا کہنا ہے کہ کشمیر کے باشندے ہند آریائی نسل کی ایک شاخ ہیں اور اس کے ثبوت میں بھی وہ کشمیری زبان میں سنسکرت الفاظ اور اہلِ کشمیر کے چہروں کی بناوٹ سے اسی طرح استدلال پیش کرتے ہیں، جس طرح اسرائیل کے نظریہ کو تسلیم کرنے والے۔

وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے عناصر کشمیری زندگی میں داخل ہوتے گئے۔ یہ یونانی، سامی اور ایرانی تہذیب کے اثرات ہیں۔ کشمیر کے قدیم لوگ ناگ پوجا کرتے تھے۔ اسی لئے یہاں کی زندگی اور ادب میں ناگ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بیک وقت ایک قوم بھی ہے اور سانپ بھی۔ کشمیر کے اکثر لوگ قصوں میں "ناگ" بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں ـــ "ناگ" کشمیر کے اکثر چشموں کے نام کا بھی ایک جُز ہے۔ مثلاً کوثر ناگ، نیل ناگ، ویری ناگ وغیرہ۔ برہمنیت اور بُدھ مت نے بھی اس رجحان کو ختم نہیں کیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے علماء کے ساتھ اسلام اور ایرانی تہذیب کشمیر پہنچی۔ اور فارسی زبان کو فروغ ہوا۔ ایک زمانے میں کشمیر پر ایرانی تہذیب کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے تھے اور فارسی زبان میں لکھنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ اہلِ ایران کشمیر کو "ایرانِ صغیر"؎ کہنے لگے تھے۔ کشمیر کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اسلامی عہد میں ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح جہاں مقامی زبانوں نے فروغ پایا، کشمیری زبان بھی فروغ پانے لگی۔

؎ اہلِ ایران کا کشمیر کو ایرانِ صغیر کہنا ثابت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں [illegible] حوالہ میں ملتا ہے۔

کشمیری برہمن، جو پنڈت کہلاتے ہیں، کشمیر کی سماجی، علمی اور سیاسی زندگی میں ایک اہم حصہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک ترقی پسند گروہ ہے جس میں نئے اور مفید تصورات کا خیر مقدم کرنے کا رجحان عام ہے۔ قدیم زمانے میں انہوں نے سنسکرت زبان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ کشمیر کے مسلمان سلاطین کے دور میں انہوں نے فارسی زبان سیکھی اور سرکاری ملازمتوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ فارسی پڑھ کر جو پنڈت ملازمتوں میں داخل ہوتے وہ "کارکن" کہلاتے تھے۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے بعد، اس کا سب سے پہلے خیر مقدم کرنے والے اور ریاست میں نمایاں عہدے حاصل کرنے والے بھی پنڈت ہی تھے۔ چنانچہ ان میں تعلیم کا فیصد اسی فیصد کے قریب ہے۔

سکھ فرقے کے لوگ بھی وادی میں کافی تعداد میں آباد ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ برہمن ہیں جنہیں راجہ سکھ جیون مل نے (۱۷۵۴ء میں) پنجاب سے درآمد کیا تھا۔ لیکن سکھوں کے عہد میں انہوں نے سکھ مذہب قبول کر لیا۔ کچھ مغل اور پٹھان نسل کے لوگ بھی ہیں جو اب کشمیری زندگی میں گھل مل گئے ہیں۔ بارہ مولہ کے آگے جہلم کی وادی میں بمبہ اور کھکھہ بھی آباد ہیں۔ یہ کسی زمانے میں بڑے جنگ جو لوگ تھے۔ لیکن اب عموماً زراعت، یا تجارت کے پیشے میں لگ گئے ہیں۔ "چوپان" چرواہے ہیں۔ کچھ بھانڈ اور بھگت بھی ہیں، جو ہندوستان کے مراثیوں کے مماثل ہیں۔

ہانجی کشمیر کا مشہور فرقہ ہے، جو ہند کے مانجھی کے مماثل ہے۔ ان کا پیشہ عموماً کشتی بانی ہے۔ یہ کشمیر کے بہت قدیم لوگ ہیں اور اپنے آپ کو حضرت نوحؑ کی اولاد سے بتاتے ہیں۔ یہ بڑے محنتی اور سلیقے والے لوگ ہیں۔ جو اپنے سجے سجائے شکاروں میں مسافروں کو دریا کے پار پہنچانے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنے

ہاؤس بوٹ میں مہمانوں کی قرار واقعی خاطر نواضع کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے ہاؤس بوٹ جو جہلم اور ڈل میں ایک سرے سے دوسرے تک پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں، کشمیر کی خصوصیت ہیں۔ ان میں مسافر قیام کرتے ہیں اور ان کے کھانے پینے کا بھی ہانجی بڑے سلیقے سے اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے ڈونگے خود ان کے رہنے کے لئے ہوتے ہیں اور ناو سامان پہنچانے کے کام آتے ہیں۔

کشمیریوں کا عام لباس بھی، یہاں کی دوسری چیزوں کی طرح ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ مرد اور عورتیں ڈھیلے ڈھالے پھیرن (پیرہن) پہنتے ہیں، جن کے اندر سردیوں کے موسم میں وہ آگ کی کانگڑی پکڑے رہتے ہیں۔ جو سردی سے بچنے کا بہت آسان اور سستا ذریعہ ہے۔ پیرزادہ محمد حسین عارف نے جو کشمیر میں جج رہے تھے۔ اپنی ایک نظم میں کشمیری لباس پر یوں چھینٹے اڑائے ہیں۔

حسین اس ملک کے ضرب المثل ہیں سارے عالم میں
لباس ان کا مگر میں نے بہت ہی بدنما دیکھا

یہ نظم جو "آئینہ کشمیر" کے عنوان سے رسالہ "مخزن" لاہور میں چھپی تھی۔ اس کے جواب میں کشمیر کے ایک شاعر، پنڈت ساگ رام سالک نے ایک طویل نظم لکھی تھی، جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اس نظم میں کشمیری لباس کے بارے میں کہا تھا ؎

تماشہ حضرت عارف نے جو کشمیر میں دیکھا
وہ سب میں نے بہ شکل نظم مخزن میں چھپا دیکھا
لباس بدنما کا عیب کیوں ہم پہ لگاتے ہو
کہاں جامہ فقیروں کا کسی نے خوشنما دیکھا

قدیم وضع کے مرد سر پر عمامہ باندھتے ہیں جو شرافت کی نشانی سمجھی جاتی ہے عورتیں سر پر کسابہ باندھتی ہیں جس سے سر ڈھکا رہتا ہے۔ پنڈت خواتین عموماً سفید

سیلی سی سر پر باندھتی ہیں لیکن پڑھے لکھے لوگ اب سوٹ پہننے لگے ہیں اور عورتیں عموماً شلوار اور قمیض، سر پر اوڑھنی یا ڈوپٹہ لیکن یہ چہرہ کو چھپانے کے لئے نہیں بلکہ جیسا کہ بامزئی نے لکھا ہے دھوپ سے چہرے کو بچانے کے لئے اوڑھا جاتا ہے۔ آجکل گاؤں کے مرد مخروطی ٹوپی سر پر پہنتے ہیں اور عورتیں چاندی کے گہنے پہنتی ہیں۔

کشمیر کی سرزمین کی ممیز طبعی اور جغرافیائی خصوصیات کی طرح، یہاں کی سماجی زندگی کے طور طریق اور رسم و رواج بھی امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں۔ ولادت اور خاص طور پر شادی بیاہ کے رسوم مخصوص ہیں۔ کشمیری گھرانوں میں لڑکے کی ولادت پر بڑی خوشی منائی جاتی ہے، عزیز و اقارب اور دوست احباب مولود کے گھر جاکر، اس کے ماں باپ اور اہل خاندان کو مبارک باد دیتے ہیں۔ لیکن جب کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے، تو شاید لڑکی کے ماں باپ سے زیادہ عزیزوں اور دوستوں کو پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔ جس طرح لڑکے کی ولادت پر، مولود کے گھر جاکر ماں باپ اور اعزا کو مبارک باد دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح دوست احباب اور خاص طور پر عزیز و اقارب لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کا سبب لڑکی کے ماں باپ کے لئے، لڑکی کی ذمہ داریاں اور خاص طور پر اس کی شادی کے موقع پر جہیز کی لعنت ہے۔ ہندوستان کی طرح، کشمیر میں بھی، لڑکی کی شادی اور جہیز کے مصارف بہت ہوتے ہیں۔

شادیوں میں مصارف کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ سینکڑوں لوگوں کی ضیافت کا انتظام کیا جاتا ہے اور غریب سے غریب آدمی بھی دس بارہ طرح کے کھانے ضرور تیار کرواتا ہے۔ شادی کے رسوم کے لحاظ سے پنڈتوں اور مسلمانوں میں فرق ہے۔ مسلمانوں میں قدیم زمانے میں لڑکے اور لڑکی کے خاندان، اس کی شہرت اور

لہ آج کل چوڑی دار پائجامہ کا بھی استعمال بڑھ رہا ہے خاص کر اسکول اور کالج کی لڑکیوں میں۔

وسائل معاش کا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ جب یہ مراحل خیر خوبی سے طے ہو جاتے، تب بھی رشتہ کو کچے دھاگے کی گانٹھ کہا جاتا تھا۔ اور اس کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے لڑکے والوں کو طرح طرح کے تحفے اور تحائف سے خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب یہ مراحل بھی طے پا جاتے تو نشانی یا سخن بندی کی تقریب ہوتی۔ جو ہندوستان میں منگنی کی تقریب کے مماثل ہے۔

جب شادی طے پا جاتی اور دن اور تاریخ کا تعین ہو جاتا، تو دُلہن کو تیار کرنے کا بڑا اہتمام کیا جاتا۔ دِنوں پہلے اس کے بال کھول کر، انہیں کندھوں پر بکھیر دیا جاتا اور انہیں بار بار گھی مل کر ملائم کرنے کی کوشش کی جاتی۔ شام کے وقت ہمسایہ عورتیں، دُلہن کے گھر جمع ہو جاتیں اور لباس اور گہنوں کا معائنہ ہوتا۔ اور ان پر بحث و مباحث ہوتے۔ شادی منڈھ جانے کے بعد، جس طرح ہندوستان میں دُلہن کو مانجھے بٹھلانے کی رسم ہے، کشمیر میں یہ دُلہن کی تیاری کی رسم ہے۔ اس دوران دُلہن کو نہلانے سے منع کیا جاتا ہے۔ اور ہر روز بالوں میں گھی ملا جاتا۔ آنکھوں میں کاجل یا سُرمہ لگایا جاتا ہے، اور اس کے جسم پر بھی گھی ملا جاتا ہے اور خیال یہ ہے کہ اس سے اس کی جلد نرم پڑ جاتی ہے۔

شادی یا عقد سے ایک دِن پہلے کی رات مہندی کی رات ہوتی ہے۔ ایک بڑے برتن میں مہندی بھر دی جاتی ہے جسے کشمیری میں "ماٗنزٕ ڈٗل" کہا جاتا ہے اور عورتیں اپنے ہاتھوں میں مہندی لگاتی اور دُلہن کے ہاتھوں میں بھی مہندی رچاتی ہیں۔ عورتیں گیت گاتی ہیں، جن میں دھوبن کا ذکر روایتی طور پر ہوتا ہے۔ اسے کشمیری زبان میں "ڈٗبی باٗئی" کہتے ہیں۔ اس کے دوسرے دِن رات میں برات آتی ہے، جسے کشمیری میں "یینہٕ وول" کہتے ہیں۔ دُلہا اب بھی قصبات میں گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے۔ لیکن شہروں میں، موٹر نے اب گھوڑے کی جگہ لے لی ہے۔ امیروں کی شادیوں میں موٹروں کا جلوس

جاتا ہے۔ دُلہا جب دُلہن کے گھر پہنچتا ہے۔ تو دُلہن کے والد کے دوست، احباب، عزیزو اقارب سب دُلہن کے گھر پر جمع ہوتے اور دو رویہ استادہ ہوکر، برات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ پنڈتوں میں بھی یہی رسم رائج ہے۔ خیر مقدم کرنے والے دُلہے کو پھولوں کے ہار بھی پہناتے ہیں۔ عورتیں اکٹھی ہوکر دُلہا اور دُلہن کی خوبیوں کے گیت گاتے ہیں۔ اور برات کے ساتھ آنے والوں کے لئے ضیافت ترتیب دی جاتی ہے۔ کشمیر میں یہ رسم عام ہے کہ دُلہا رات گئے، دُلہن کے گھر پہنچتا ہے اور ضیافت کے وقت تک آدھی رات ہو جاتی ہے۔ ضیافت سے فارغ ہونے کے بعد، عقد کا فریضہ اگر پہلے انجام نہ پا چکا ہو تو، انجام پاتا ہے۔ پنڈتوں کے یہاں دُلہا اور دُلہن کے خاندانی پروہت لگن کی رسم انجام دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں نکاح نامہ فارسی اور بعض وقت اُردو میں بھی لکھا جاتا ہے۔

دُلہن کی رُخصتی کے وقت عورتیں گیت گاتی ہوئی، برات کے ساتھ تھوڑی دور جاتی ہیں۔ یہ گیت بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان میں بڑا مزاح ہوتا ہے اور دُلہن کے اوصاف بیان کرکے، دُلہا کو نصیحت کی جاتی ہے کہ اس کو آرام اور آسائش سے رکھے اور قدر کا برتاو کرے۔

کشمیر میں خانہ دامادی کا طریقہ بھی ہے، جو پنڈتوں کے یہاں کی متبنیت کے مماثل ہے۔ پنڈتوں میں بے اولاد ماں باپ متبنی لیتے ہیں اور متبنی اپنے خاندان سے خارج ہو جاتا ہے اور متبنی لینے والے خاندان میں داخل ہو جاتا اور اسی خاندانی نام سے موسوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک "تکو" خاندان کا لڑکا جب "کول" خاندان میں متبنی لیا جاتا ہے تو وہ "کول" کے خاندانی نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔

دلہن کی رُخصتی سے پہلے دُلہن کو پہلے گھی کی مالش کرتی اور پھر روایتی گیت گا گا کر، اسے نہلاتی، دُھلاتی اور زرق برق پوشاک پہنا کر تیار کر دیتی ہیں۔ "پھرن"

پھیرن)، جو اہلِ کشمیر کا مخصوص فرغل جیسا لباس ہوتا ہے، دُلھن کو بڑھیا قسم کا دیا جاتا ہے۔ اس پر زر دوزی کا کام ہوتا ہے سر پر " قصابہ " باندھا جاتا ہے۔ اس کی شکل مندر کے کلس سے ملتی جُلتی ہوتی ہے۔ یہ ایک نفیس اور مہین کپڑے سے تیار کیا جاتا ہے اور پہلے زمانہ میں اس پر طرح طرح کے زیور سوئیوں سے ٹانک دیئے جاتے تھے۔ ان زیورات پر ایک سونے کی زنجیر باندھ دی جاتی ہے۔ اور اس زنجیر کا ایک سرا کان کی بالیوں سے جنہیں کشمیری میں " بالہ ہور " کہتے ہیں، جوڑ دیا جاتا ہے۔ قصابہ پر بنارسی یا گُل بوٹے بنا ہوا ڈوپٹہ اڑھا دیا جاتا ہے اور سوئیوں سے اسے قصابہ سے پیوست کر دیا جاتا ہے۔

بالوں کو چوٹیوں کی شکل میں گوندھ کر ان میں خوبصورت گیند نما چاندی کا زیور باندھ دیا جاتا ہے۔ جسے کشمیری میں " وانکہ ین " کہتے ہیں۔ دُلھن جب چلتی ہے تو یہ گھنگھرو کی طرح بجتا ہے۔ گلے میں سونے یا چاندی کا گلوبند باندھا جاتا ہے جس کے ساتھ سونے یا چاندی کا گھڑی کی لٹکن جیسا ایک زیور لگا دیا جاتا ہے۔ اُسے جگنی کہتے ہیں۔ اس سے بھی چلنے میں آواز پیدا ہوتی ہے۔ شریف گھرانوں میں پھرن میں ضرورت سے زیادہ آستین لگا دی جاتی تھی، جسے " قرابہ " کہتے تھے۔ دُلھن کے ہاتھ کی انگلیوں میں حسبِ مقدور سونے یا چاندی کی انگوٹھیاں پہنائی جاتی ہیں۔ جنہیں " آنہٕ داج " کہتے ہیں۔ بازوؤں پر سونے یا چاندی کے کڑے پہنائے جاتے ہیں اور انہیں " ڈیجہ بَنگرہ " کہتے ہیں۔ پاؤں میں بھی جھانجھ جیسی آواز پیدا کرنے والے کڑے پہنائے جاتے ہیں۔ پھرن پر چاندی کا ایک دانت خلال بھی لٹکا دیا جاتا تھا۔ دُلھن سُسرال جاتے ہوئے، اپنا " مُقاب " ساتھ لے جاتی تھی۔ جس میں رومال، عطر، آئینے، کنگھے، سُرمہ اور دوسرے آرائشی اشیاء ہوتے تھے۔ سُسرال پہنچ کر، دُلھن یہ اشیاء، لڑکیوں اور سہیلیوں میں بانٹ دیتی تھی۔ دُلھن کے چہرہ کا سنگھار بھی بڑے اہتمام سے کیا جاتا، اور مقیش اور سنہری چمکتے ہوئے پاوڈر کے ذروں سے

اُس کے حُسن کی جوت بڑھائی جاتی تھی۔

رسمیں، ہندوستان کی طرح اب کشمیر میں بھی کم ہوتی جا رہی ہیں۔ تاہم متوسط گھرانوں میں ان کی پابندی اب بھی کی جاتی ہے۔ دُلہن، کچھ دن، دُلہے گھر رہنے کے بعد پھر میکے واپس آجاتی ہے۔ اور رسم یہ ہے کہ اسے پھر واپس بھیجنے کے لئے ضیافت ترتیب دی جاتی ہے۔ یہ ضیافت شادی کے دن کی ضیافت کی طرح وسیع پیمانے پر نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس میں دُلہا اور دُلہن کے قریبی عزیز اور دوست احباب مدعو کئے جاتے ہیں۔ اس تقریب کے منعقد ہونے تک دُلہا، دُلہن کے گھر نہیں جاتا۔

کشمیر کی شادیوں کی ضیافت بھی طرح طرح کے پکوان اور ساتھ بیٹھ کر کھانے کے طریقے میں ایک امتیاز رکھتی ہے۔ متمول گھرانوں کی شادیوں میں، بیس اور پچیس دور (کورسس) تک ہوتے ہیں اور متوسط خاندانوں میں بھی بارہ پندرہ دور سے کم کی ضیافت نہیں ہوتی۔ خشکا یعنی اُبلے ہوئے چاول یا بھات کشمیر کی عام غذا ہے۔ اسی لئے دعوتوں کو "وازہ ون" کہتے ہیں۔ "وازہ" ہمارے یہاں کا باورچی ہے۔ دعوتوں میں خشکے کے ساتھ مختلف طریقوں سے تیار کئے ہوئے گوشت کے سالن ہوتے ہیں۔ جن میں رِشتہ، مطبق، اور سب سے زیادہ لذیذ "گوشتابہ" ہے۔ "رِشتہ" ہمارے یہاں کے کوفتہ جیسا ہوتا ہے اور گوشتابہ، پسے ہوئے گوشت کا دودھ میں پکایا ہوا بہت بڑا تقریباً ٹینس کی گیند جتنا کوفتہ ہے۔ جو کشمیری دعوتوں کی کی خصوصیت، اور یہاں کا سب سے لذیذ پکوان ہے۔

ضیافتوں میں کھانوں کے دور کی معین ترتیب ہوتی ہے اور مہمانوں تک یہ اسی ترتیب سے پہنچائے جاتے ہیں۔ وازہ، خود انہیں لاتے ہیں۔ ہر چار مہمانوں کے لئے ایک بڑی سینی میں چاول، تلا ہوا مرغ، کباب، اور مطبق کے ساتھ کوئی سبزی، جوڑ کر رکھی جاتی ہے اور چار چار مہمان ایک ساتھ ایک سینی

میں کھاتے ہیں۔ مختلف ڈِش ترتیب سے یکے بعد دیگرے، دلنہ اوازوالی لاکر ہر ایک مہمان کو پہنچاتا ہے۔ سب سے آخر میں "گوشتابہ" آتا ہے اور ایک چاروں مہمان تقسیم کر لیتے ہیں۔

جب سب مہمان کھا چکتے ہیں تو سب سے زیادہ بزرگ مہمان خُدا کی ان نعمتوں کا شُکرانہ ادا کرتا ہے اور سینیاں اُٹھائی جاتی ہیں اور دستر خوان ہی پر مہمانوں کے ہاتھ سیلاب چی اور آفتابے سے دُھلائے جاتے ہیں اور دستر خوان بڑھایا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں شادی کی تقریب کے بارے میں گورنمنٹ وومنز کالج، سری نگر کی ایک طالبہ اختر سعید رفاعی نے کشمیر میں دُلہن کا سنگار، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کے مختلف مقامات سے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ تفصیل زیادہ تر اب سے کچھ برس پہلے کی ہے۔

' شادی کے مسئلے میں ذات اور خاندان اور کسب معاش کا حد سے زیادہ خیال رکھا جاتا تھا اور جب اس سے فراغت حاصل ہوتی تو بھی رشتہ کو کچے دھاگے کی گانٹھ کہاں جاتا تھا۔ پھر اس کو مضبوط کرنے کے لئے قسم قسم کے خوان اور تحفے لڑکے والوں کے نذر کئے جاتے تھے اور جب اس طرح بات بن جاتی تھی تو نشانی یا سخن بندی کی تقریب سرانجام دی جاتی۔ اس کے بعد جب شادی کے دن قریب آتے تو ہونے والی دُلہن کے بال کھول کر انہیں کندھوں پر پریشان رکھ دیا جاتا تھا۔ شام کے وقت اپنے اپنے گھر کے کام کاج سے فراغت پا کر ہمسایہ عورتیں دُلہن کے گھر جمع ہو جاتیں وہاں زیورات، پہننے کے لباس اور دوسری باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس طرح رات کو دُلہن کے سر کے بالوں میں گھی کلفی مل دیا جاتا۔ دُلہن کو نہانے کی ممانعت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر روز کاجل اور دوسرے مقوی سُرمے لگائے جاتے تھے۔ ان چیزوں

کے کرنے سے صرف یہ بات مقصود ہوتی تھی کہ شادی کے دن تک دُلہن کی جلد نرم پڑ جائے۔
شادی کے دن سے پہلے مہندی رات کی تقریب منائی جاتی تھی۔ اس دن کا انتظار
نہایت شوق اور ذوق سے کیا جاتا تھا۔ ایک بڑا برتن جسے کشمیری میں "مَانزِ ڈُل"
کہا جاتا ہے۔ مہندی سے پُر کیا جاتا تھا۔ اس کو عورتیں اپنے اور دُلہن کے ہاتھوں میں
لگاتی تھیں۔ رات روایاتی گیتوں میں دھوبن کا عنوان بھی ہوتا تھا۔ کشمیری زبان
میں اسے "دُبی بائے" کہتے ہیں۔ دوسرے دن برات آتی ہے، جس کو کشمیری میں
"یینہِ وول" کہتے ہیں۔ اس دن دُلہن کے بالوں میں نئے سرے سے گھی لگا کر
انہیں مزید ملائیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عورتیں روائیتی گیتوں کے ساتھ دُلہن کو
نہلاتی ہیں۔ دُلہن کو زرق برق پوشاک پہنائی جاتی تھی۔ پھرن اعلیٰ پایہ کا ہوتا تھا۔
اس پر زردوزی کا کام ہوتا اور سر پر "قصابہ" رکھ دیا جاتا۔ اس کی شکل مندر کے
کلس سے ملتی جلتی ہے۔ یہ ایک خاص باریک کپڑے سے تیار کیا جاتا تھا، شکل گول
ہوتی تھی اور اس پر قسم قسم کے زیورات سوئیوں سے چسپاں کئے جاتے تھے۔ ان زیورات
کے اوپر ایک سونے کی زنجیر رکھی جاتی تھی۔ اور یہ زنجیر کانوں کی بالیوں سے جنہیں
کشمیری میں "بالہ ہور" کہا جاتا تھا باندھ دی جاتی تھی۔ قصابے کے اوپر بنارسی ڈوپٹہ
یا گلکاری کیا ہوا ڈوپٹہ بذریعہ سوئیوں کے سر پر اڑھا دیا جاتا۔ سر کے بالوں کو تجربہ کار
عورتیں بہت دنوں تک یاف کرتی تھیں۔ اکثر دُلہن کو کسی عورت کے گھٹنے پر دیر
تک سر رکھے رہنے سے نیند بھی آجاتی تھی۔ اس کے بعد بالوں کی چوٹیوں کو گوندھ کر
اس میں چاندی کا گیند نما خوبصورت زیور باندھ دیا جاتا تھا۔ اس کو کشمیری میں
"وانکہ پن" کہا جاتا ہے۔ چلنے میں اس سے آواز نکلتی اور دور تک سُنائی دیتی تھی۔
گلے میں سونے یا چاندی کا گلوبند باندھ دیا جاتا جس کے ساتھ گھڑی کے پنڈلم جیسا
سونے یا چاندی کا زیور لٹکتا رہتا۔ اس کا نام جُگنی تھا۔ اس سے بھی گھونگروں کی

سی آواز نکلتی تھی۔ شرفا کی عورتیں "قرابوں" کا استعمال کرتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھرن میں ضرورت سے زیادہ آستین لگا دی جاتی تھی۔ یہ سوئیوں کے ذریعے بند رہتی تھیں۔ انگلیوں میں سونے یا چاندی کی انگوٹھیاں پہنائی جاتی۔ جسے کشمیری میں "اَنہ واَج" کہتے ہیں۔ بازوؤں پر سونے یا چاندی کے کڑے پہنائے جاتے۔ انہیں کشمیری میں "وُسی بنگر" کہتے ہیں۔ پاؤں میں جھانجھ جیسی آواز پیدا کرنے والے کڑے پہنائے، جو سونے یا چاندی کے ہوتے۔ پھرن پر چاندی کا دانت خلال لگا دیا جاتا تھا۔ دُلہن اپنے سسرال جاتے وقت اور چیزوں کے علاوہ "مُقاب" ساتھ لے جاتی تھی، جس میں رومال، عطر، آئینے، کنگھے، ناڑے، سُرمہ، چاندی کا گز وغیرہ ہوتا تھا۔ دُلہن سسرال پہنچ کر یہ چیزیں اپنی سہیلیوں میں بانٹ دیتی تھی۔ دُلہن کے منہ پر مقیش لگائی جاتی، جس سے وہ اور زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

شادی کے دوران دولہا کا لقب مہا رازہ (راجہ) ہوتا اور دُلہن کا مہارین (مہارانی)۔ شادی یا کتخدائی کی اصطلاح میں زُفاف یا رُخصتی کے بعد دلہن ہفتہ بھر سُسرال میں رہتی، اس کے بعد وہ میکے جاتی اور اس وقت تک وہاں مقیم رہتی جب تک دُلہن والے ضیافت ترتیب دے کر، دُلہا اور اس کے گھر والوں کو مدعو نہ کریں۔ اور ضیافت کے بعد دُلہن کی دوبارہ رُخصتی عمل میں آتی ہے"۔ پنڈتوں کے یہاں بے اولاد ماں باپ متبنیٰ لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ متبنیٰ لینے والے کے خاندان کا فرد تصور ہوتا ہے اور متبنیٰ لینے والے کا خاندانی نام اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے ایک تکو خاندان کا لڑکا "کول" خاندان میں متبنیٰ لیا جاتا ہے، تو اس کے نام کے ساتھ کول کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ تکو نہیں کہلاتا۔

تہوار اور تقریبیں جیسے عید، محرم، ہولی، شوراتری وغیرہ جو مذہبی نوعیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مشترک تقریبیں بھی ہیں جو ہیں نوروز شیعہ فرقے کے لوگ اہتمام سے مناتے ہیں۔

ریاست کے سرحدی ضلعوں، دردستان اور لداخ کے باشندوں میں بھی بہت سی رسمیں رائج ہیں، جو ان مقامات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ دردستان کے باشندے معتدل جسامت اور متناسب اعضا، کے پہاڑی لوگ ہیں۔ جو قدیم زمانے میں وادی کے باشندوں پر بلا کی طرح نازل ہوتے تھے۔ لیکن گلاب سنگھ کے انہیں مغلوب کر لینے کے بعد سے یہ امن پسند ہو گئے ہیں۔ ان میں سوائے چند دیہات کے ساری آبادی مسلمانوں کی ہے۔ ننگا پربت کے مغربی پہاڑیوں میں بسنے والے چلاہی، کہلاتے ہیں۔ اس علاقے کی سرد آب و ہوا کی وجہ سے لوگ اونی کپڑے، کوٹ، پاجامہ اور چغہ پہنتے ہیں۔ ان کے سر کا لباس، کیسہ نما ٹوپی ہوتی ہے، جس کے کنارے اوپر کو موڑ لئے جاتے ہیں۔

وادی کشمیر کا شمال مشرقی علاقہ بلتستان کا ہے، جو لداخ اور دردستان کے درمیان واقع ہے، اور یہاں کے باشندوں میں دونوں علاقوں کا میل نظر آتا ہے۔ وہ کسی قدر دراز قد اور گٹھیلے جسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں کثرت ازدواج رائج ہے، اس لئے آبادی بڑھتی رہتی ہے اور چونکہ ان کے ملک میں مایحتاج کی کمی ہے۔ اس لئے یہ اطراف واکناف اور ہندوستان کے علاقوں میں محنت مزدوری کے لئے نکل جاتے ہیں۔ ان کے لباس بھی اونی ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں انگور بہت پیدا ہوتا ہے، باقی غلہ وغیرہ کی کاشت برائے نام ہے۔

لداخ کے باشندوں کے خط و خال تورانی ہیں۔ ان کے قد چھوٹے، گال کی ہڈی ابھری ہوئی اور ناک پچکی ہوئی ہوتی ہے۔ طبیعت کے لحاظ سے یہ بشاش

اور خندہ جبیں ہوتے ہیں اور کاروبار اور معاملات میں ان کی ایمانداری مشہور ہے۔ ان میں محنت مزدوری کرنے والے اپنی جفاکشی اور بوجھ اُٹھانے کی ہمت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ لداخیوں کے لباس اون کے لمبے چُغے اور عموماً مخمل کی ٹوپی ہوتی ہے۔ عورتیں سر پر اوڑھنی اوڑھتی ہیں۔

لداخ کے ہر گاؤں میں ایک گومپا ہوتا ہے۔ جس سے مذہبی اور دنیوی دونوں کام لئے جاتے ہیں۔ لداخ کے باشندوں کی اکثریت بودھ مذہب کی پیرو ہے۔ اور کچھ مسلمان بھی ہیں۔ لداخ کے بودھی بھی گوشت خور ہیں۔ لاما ان کے سردار ہوتے ہیں جو مذہبی رہنمائی کے علاوہ خصومات کا فیصلہ بھی کرتے ہیں۔

کشمیر قدیم عہد سے، علم وفن کی طرح فنونِ لطیفہ کی پیدائش اور افزائش کا مرکز رہا ہے۔ کشمیر کے فنکاروں کی ذہانت رقص و سرود، ناٹک کاری، تعمیر، نقاشی اور خطاطی جیسے متنوع موضوعات میں نمایاں رہی ہے۔ یہ کشمیر کے ماحول کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ کشمیر کے بلند قامت کوہستان، عمیق وادیاں، پھوٹتے اُبلتے چشمے، بہتے گنگناتے آبشار، شاداب مرغزار، حسین چنار، اور سرو شمشاد کو مات دینے والے سفیدوں کی قطاریں، رنگ برنگے پھول اور ان کے شوخ رنگ، صورت میں حسین اور مزے میں لذیذ پھل، یہ فطرت کے حُسن اور خوبی کے اجزا کا ایسا اجتماع ہے کہ کسی صاحبِ ذوق کے لئے دعوتِ نظر نہ بنے اور اس میں مضمر فنکار کو منظرِ عام پر نہ لائے تو حیرت کی بات ہوتی۔

قدیم عہد کے فنی نمونے اب کمیاب ہیں۔ تاہم مورخین کی روایات جو ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے واضح ہے کہ کشمیر فنونِ لطیفہ کا گھر رہا ہے۔ رقص و سرود، اہلِ کشمیر کی اولین دلچسپی کے مرکز تھے۔ ناچ (نرت) ہندو مذہب میں ایک تقدس کا موقف رکھتا ہے۔ چنانچہ مندروں میں دیوتاؤں کی بارگاہ میں نرتکی اپنے فن

کے بہترین نمونے پیش کرکے، ان کے آشیرواد کی متمنی رہتی تھی۔ ہارون کی کھدائیوں میں جو اینٹیں اور ٹھیکرے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض پر رقص کے اوضاع اور سرود کے آلات کے نقوش سے وادی میں اس فن کی قدیم ترین عہد میں ترقی کے نشانات ملتے ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اس فن کو جو عروج حاصل ہوا تھا، اس کا اندازہ ہم کو، اس موضوع پر لکھے ہوئے کارناموں سے ہوتا ہے۔ جن کے مصنف اُدبھٹا، لولاپٹا، شنکوکا، بھٹانایک اور خاص طور پر ابھینوا گپتا جیسے ماہرین فن ہیں۔ راجہ اشوک کے بیٹے جلوکا اور راجہ پرتاپ دتیہ، للتا دتیہ اور جیکر ورمن کے موسیقی سے شغف کے واقعات ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں۔ راجہ ہرش کو رقص اور موسیقی میں اتنی مہارت تھی کہ وہ نو عمر لڑکیوں کو اس فن کی تربیت دیتا تھا۔

گیارہویں صدی عیسوی میں راجہ کلش نے کشمیر میں سنگیت کو رواج دیا تھا۔ موسیقی کے سازوں میں طنبورا، بانسری، ڈھول اور مشک باجا سنگیت کے لازمی اجزاء تھے۔ اور مندروں میں رقص مقدس فریضہ کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ موسیقی کے اس فنی اور کلاسیکی پہلو کے ساتھ ساتھ، عوام میں لوک ناچ بھی مقبول تھے، جن کے نمائندہ اس عہد میں رؤف اور چھکری ہیں۔

اسلام میں موسیقی کو حرمت آئی ہے، اس کے باوجود، ماحول کے اثر نے کشمیری سلاطین میں بھی رقص و سرود کے ذوق کی افزائش کی۔ لیکن اس نئے دور میں، کشمیری موسیقی میں ایران اور وسط ایشیا کے اثرات بھی داخل ہونے لگے۔ اس سلسلے میں سلطان زین العابدین کی دلچسپی کا تذکرہ ضروری ہے۔ وہ کلاسیکی موسیقی کا ماہر تھا اور اس نے اس فن کو فروغ دینے کے لئے کئی ماہر موسیقاروں کو دربار میں ملازم رکھا تھا اسے کشمیری، شمالی ہند، جنوبی ہند، ایران

وسط ایشیا، غرض ہر ہنچ سے دلچسپی تھی۔ کرناٹک کی مخصوص موسیقی کے ماہر بھی اس کے دربار میں موجود تھے۔ اسی دلچسپی کے باعث اس نے اپنے بیٹے، حیدر کو موسیقی کی تعلیم دلائی تھی۔ مُلّا جمیل اس کے دربار کے ماہر فن موسیقار تھے اور ایرانی اور عربی موسیقی کے نمونے سلطان کے دربار میں پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے دربار کا ایک اور مغنی زعفران بھی تھا۔ سلطان نے ترکستان سے رباب منگواکر، کشمیر میں رائج کیا تھا۔

زین العابدین کے بعد، سلطان حسن شاہ اپنے موسیقی کے ذوق کی وجہ سے بہت ممتاز رہا۔ اُسے موسیقی سے نہ صرف دلچسپی تھی، بلکہ خود بھی اس فن میں مہارت رکھتا تھا۔ اس فن کی تعلیم اور تربیت کا بھی اس نے اچھا اہتمام کیا تھا۔ اور ہندوستان سے بارہ سو ماہرین فن کو بلواکر اپنے دربار میں ملازم رکھا تھا۔ سریورا جو سنسکرت کا عالم، مورخ تھا اور موسیقی کا بھی استاد مانا جاتا تھا۔ حسن شاہ کے قائم کئے ہوئے محکمۂ موسیقی کا صدر رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کی موسیقی سے دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے، اس کے دربار کے موسیقاروں میں تین رتن مالا، دیپ مالا، اور ہرب مالا کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے اور ان کے فن کی تعریف کی ہے۔ سریورا نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسن شاہ نے موسیقی کے فن پر فارسی اور ہندوستان کی ایک بولی میں کتاب بھی لکھی تھی۔

میرزا حیدر دوغلات کو بھی موسیقی سے شغف تھا۔ اور اس فن کو فروغ دینے پر توجہ بھی صرف کی تھی۔ جہانگیر نے میرزا حیدر کی موسیقی سے دلچسپی کی تعریف کی ہے۔

چک سلاطین میں حسین شاہ چک کو بھی رقص و سرود سے لگاؤ رہا تھا۔ یوسف شاہ چک کے عہد میں خود اس کی ملکہ حبہ خاتون کی اس فن میں مہارت قابلِ تعریف تھی۔

وہ نہ صرف خوش گلو مغنیہ تھی، بلکہ فن پر بھی اسے عبور تھا، چنانچہ اس نے کشمیری موسیقی میں ایک راگ ایجاد کیا تھا، جو راست کشمیری کے نام سے موسوم ہے۔

مغلیہ دور میں فارسی موسیقی کے ساتھ ترکستان کے اوضاعِ رقص کو کشمیر میں فروغ ہونے لگا تھا۔ اکبر کو اس فن سے لگاؤ تھا اور اس کے دربار میں ہندو، ایرانی، تورانی اور کشمیری موسیقار موجود تھے۔ نئے اثرات کی بدولت کشمیری موسیقی میں ایرانی، ہندوستانی اور کشمیری کا امتزاج عمل میں آیا تھا۔ صوفیانہ کلام جو کشمیر کے ساتھ مخصوص ہے اور حافظہ کا رقص، اس عہد کی نشوونما ہیں۔ سنطور، ساز کشمیر اور طبلہ سنگیت کے لوازمات تھے۔ حافظ رقاصاؤں کے لباس کی تفصیلات مورخین نے لکھی ہے۔ ان کے چست بلاؤز اور ڈھیلے دامن ہوتے اور دامن کو کمر کے پاس باندھ دیا جاتا، سر پر کارچوبی ٹوپی اور مہین ڈوپٹہ اوڑھنی کے طور پر استعمال ہوتا۔

افغانوں کے عہد میں بچہ رقص، غالباً کابل سے درآمد ہوا تھا۔ اس میں کمسن بچے، جن کو رقص کی تربیت دی جاتی تھی، شہنائی اور ڈھولک کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ کشمیر میں موجودہ دور کا بچہ نغمہ، اسی کی یادگار ہے۔

ناچ کے ساتھ ناٹک کا گہرا تعلق ہے۔ کلہن کے بیانات سے ہندو راجاؤں کے عہد میں ناٹک کاری پر روشنی پڑتی ہے۔ راجاؤں کے اپنے مخصوص تماشہ گھر ہوتے، جہاں اداکار اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے۔ ابتدائی دور کے ناٹک کاروں میں چندرک کا نام آتا ہے، لیکن اس کے حالات معلوم نہیں ہوتے۔ روایت نے کالیداس کا تعلق بھی کشمیر سے بتایا ہے، لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

شہمیری عہد میں ہم کو سلطان زین العابدین کی ناٹک سے دلچسپی کی کافی تفصیلات ملتی ہیں۔ مورخ سریورا لکھتا ہے کہ اسٹیج کھلے باغ جیسا ہوتا تھا اور اس پر روشن قمقمے، چمپک کے پھولوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ یودھ کھیدھا کے

بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے سلطان زین العابدین کی زندگی کو موضوع بنا کر
ایک ناٹک "زینہ چرت پرکاش" کے نام سے لکھا تھا۔ اس زمانے میں اداکاری پیشہ کے
طور پر بھی اختیار کی جاتی تھی۔ حال کے زمانے تک کشمیری بھانڈ اور بھگت، سارے
ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ انہیں قدیم دور کے اداکاروں کی روایت کا
سلسلہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ اب بھی کشمیر میں موجود ہیں اور گاؤں کے لوگوں میں گھوم کر
ان کی دل بہلائی کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

نقش کاری اور مورت گری

کشمیر میں اس وقت قدیم عہد کی نقش کاری کے نمونے دستیاب نہیں
ہوتے۔ انگریز اور یورپی سیاح جو ان کی قدر جانتے تھے، یہاں سے جمع کر کے لے جاتے
رہے ہیں۔ تاہم قدیم تصانیف سے یہاں نقش کاری سے دلچسپی اور اس کی قدر و
منزلت کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم زمانے میں لڑکیوں کی تربیت کے لوازم میں سے ایک
لازمہ نقش کاری میں ان کی تربیت بھی تھی۔ اس رواج کے باقیات اب صرف
اس صورت میں ملتے ہیں کہ پنڈت گھرانوں میں بعض تہواروں میں دیواروں پر
نقش بناتی ہیں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر دروازوں اور کھڑکیوں میں گل بوٹے
بنانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

تارا ناتھ نے اپنی "ہسٹری آف بدھ ازم" میں لکھا ہے کہ کشمیر کی قدیم نقش کاری
پر مدھیہ دیس کے دبستان کا اثر تھا۔ بعد میں ہسورینے ایک نئے دبستان کی
بنیاد رکھی تھی، جو رفتہ رفتہ دبستانِ کشمیر کے نام سے موسوم ہو گیا تھا۔ بدھ مت کے
عروج کے زمانے میں نقش کاری کو مقبولیت حاصل تھی۔ بدھ متی فنکاروں کا
مقصد، ان آدرشوں کی صورت گری ہوتا تھا، جو ان کے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ مذہبی احساسات کو وہ تصویری حکایات کی شکل میں پیش کرنے میں
بھی ماہر تھے۔ نقش کاری کی یہ روایات کشمیر سے باہر تبت اور وسطِ ایشیا تک پہنچی
تھیں۔ اس کے نمونے مغربی تبت میں اب بھی ملتے ہیں۔ کشمیری نقش کار اپنے رنگ
نباتات اور معدنی اشیاء سے بناتے تھے۔

اسلامی عہد میں انسانی موضوعات نقش کاری میں کم استعمال ہوتے تھے۔
اس کے مقابلے میں گُل بوٹوں کے نقش بنانے میں مسلمان نقش کاروں نے بڑا کمال
پیدا کیا تھا۔ سُلطان زین العابدین بڈشاہ نے اپنے عہد میں نقش کاری کو بھی فروغ
دیا تھا۔ اس کے دربار میں مُلّا جمیل، جو اچھے موسیقار تھے، نقش کاری میں بھی،
مہارت رکھتے تھے۔ زین العابدین کے بعد سلطنت میں جو مناقشے برپا ہوئے۔ ان کی
وجہ سے اس فن کی طرف سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ لیکن مغلوں کے دور میں اس فن
کو پھر ترقی نصیب ہونے لگی۔ اس کا بڑا سبب، نقش کاری کے بارے میں اکبر کے
مخصوص تصورات تھے۔ وہ نقش کاری کو عرفانِ حق کا ایک ذریعہ جانتا تھا، اس کا
عقیدہ تھا کہ نقش کار کسی ذی روح کی تصویر بناتے ہوئے اور اس کے اعضا کی
یکے بعد دیگرے نقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ محسوس کرتے لگتا ہے کہ وہ اس
میں روح نہیں بھر سکتا، اس طرح وہ روح کے بخشنے والے کی صناعی کا شعور
پیدا کرتا اور اس کی بارگاہ میں شُکر گذار ہوتا اور اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔

اکبر کے دربار سے متوسل نقش کاروں کے اتباع میں کشمیر کے نقش کاروں
کی بھی ہمت افزائی ہوئی اور اس فن کو فروغ دینا شروع کیا جو بعد میں کشمیری قلم"
سے موسوم کیا جانے لگا۔ کتابوں کے موضوعات کی نقش کاری میں کشمیر کے نقش کار
چابک دست تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے پر تصویریں بنانے میں بھی مہارت رکھتے
تھے اس طرح کی نقش کاری کے چوبیس نمونے اس وقت لندن کے البرٹ میوزیم

میں محفوظ ہیں۔

خطاطی

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق، ذی روح کی تصویر بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس لئے مسلمان فن کاروں نے گُل بوٹوں کے نقش بنانے میں زیادہ کمال دکھایا۔ اقلیدسی نقوش میں بھی انہوں نے کارنامے چھوڑے ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ ان کی توجہ خطاطی کی جانب رہی۔ ان کے نقطۂ نظر سے، خطاطی کی عظمت اور افادیت، نقش کاری سے افضل ہے۔ اسی بناء پر اسلامی عہد میں، اس فن کو بہت ترقی ہوئی۔ کشمیر کے خطاطوں میں مسلمانوں کے علاوہ کئی پنڈت خطاطوں کے نام بھی آتے ہیں۔ سلطان زین العابدین نے اس فن کو ترقی دینے کے لئے، وسط ایشیا سے بہت سے خطاطوں کو کشمیر طلب کر کے، اس فن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ لیکن اس کی کوششوں کا نتیجہ، بعد میں مغل عہد میں جا کر کہیں نمایاں ہوا۔ اور یہاں سے کئی ایسے خطاط اُٹھے، جن کی کشمیر سے زیادہ باہر قدر ہوئی۔

اکبر کے عہدوں کے خطاطوں میں مولانا عبدالعزیز اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے آگے کشمیر کے خطاط محمد حسین نے زانوئے شاگردی تہہ کیا تھا۔ لیکن فن پر ایسا عبور حاصل کیا کہ اکبر کے درباری خطاطوں میں نمایاں جگہ پیدا کر دی۔ اور "زریں قلم" کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق یہ اپنے اُستاد پر بھی فوقیت لے گئے تھے۔ اور بعض نقادوں کے خیال کے مطابق، مشہور خطاط میر علی کے ہم پلہ تھے۔ جہانگیر کے دربار میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور ایک زنجیر فیل کے عطیے سے نوازے گئے۔ محمد حسین کا انتقال ۱۶۱۱ء میں ہوا۔

محمد حسین کے معاصرین میں علی چمن نے بھی بڑا بلند رتبہ پایا تھا۔ اور اکبر کے دربار میں ان کی بھی قرار واقعی قدر و منزلت ہوئی۔ شاہ جہاں کے عہد کے خطاطوں میں محمد مراد کشمیری کو بلند رتبہ نصیب ہوا۔ شاہ جہاں نے انھیں "شیریں قلم" کا خطاب عطا کیا تھا۔ محمد مراد کے اثر نے کئی نوجوان خطاطوں کی تربیت کی۔ خود ان کے بھائی محمد محسن کو اس عہد کے خطاطوں میں اونچا درجہ حاصل تھا۔ ایک اور کشمیری خطاط، ملا باقر نے اپنے فن میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ شاہ جہاں نے ان کی سرپرستی کی۔ انھیں نسخ، نستعلیق اور شکستہ، تینوں میں مہارت حاصل تھی۔

بعد کے دور کے صاحبانِ فن میں ہم کو کمال، ابراہیم، احمد اور حیدر کے نام ملتے ہیں جنھیں اپنے اپنے زمانے میں شہرت حاصل رہی۔

تعمیر کاری

دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح، تعمیر کاری میں بھی، کشمیر کے فن کار اپنے نقوش چھوڑ گئے ہیں قدیم عہد میں کشمیر کی تعمیر کاری اپنے عروج کی منزلوں کو پہنچ چکی تھی، جس کا ثبوت ہم کو ہندو عہد کے آثار سے ملتا ہے۔ ان میں مارتنڈ، اونتی پورہ، پٹن، بنیار، پاندریٹھن، وانگت اور پرسپور کے مندر قدیم عہد کی تعمیر کاری کے عظیم الشان نمونے ہیں۔ مارتنڈ کا مندر للتادتیہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ اپنی وسعت، پتھروں پر کندہ کاری، اور ستونوں کے تناسب اور حسن کے اعتبار سے قابلِ دید عمارت ہے۔ اونتی پورہ کے مندروں میں سنگتراشی اور کندہ کاری، اس عہد کے شعورِ فن کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان میں اور پاندریٹھن کے مندر کے کام میں کشمیری تعمیر کاری کی ذہانت اور چابکدستی کا عروج نظر آتا ہے۔ شنکر اچاریہ کا مندر، جو شہر سری نگر کے قلب میں، پہاڑ کی بلند چوٹی پر، جسے فارسی میں تختِ سلیمان کے نام سے

موسوم کرتے ہیں، واقع ہے، اپنی عظمت اور اپنے موقف کے لحاظ سے دارالحکومت کی زینت بنا ہوا ہے۔

پتھر سے بنی ہوئی ان عمارتوں سے ہٹ کر، کشمیر میں ہندو راج اور بدھ مت کے عروج کے زمانے میں بہت سی عمارتیں، لکڑی کے ڈھانچوں پر اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں، جن کا اب تواریخ میں ذکر ملتا ہے۔ اسلامی عہد میں بھی تعمیر کاری کی اگلی روایات باقی رہیں۔ لکڑی اور اینٹوں کی بنی ہوئی ان عمارتوں کی وضع قطع پر، بدھ متی عہد کی تعمیروں کا اثر ہے۔ تاہم خاکوں، رنگکار اور نقوش کی حد تک شہمیری دور کی یہ عمارتیں، اس فن کے ارتقاء کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی سلطان زین العابدین کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے حکم سے بیسیوں عمارتیں، تعمیر ہوئی تھیں۔ جن میں سے نوشہرہ کا دارالعلوم، زینہ گیر اور وولر کے جزیرہ پر بنوائے ہوئے محل، اس زمانے کی قابل دید عمارتوں میں سے تھیں۔ میرزا حیدر دوغلات نے زینہ گیر کے محل کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بارہ منزلہ عمارت تھی، جس میں پچاس کمرے، ہال اور کئی گذرگاہیں شامل تھیں۔ مغلیہ دور کی ایک عمارت "پری محل" بھی قابلِ ذکر ہے، جسے داراشکوہ اور اس کی بیگم پری بیگم نے اپنے پیر اخوند ملا شاہ کے متصوفانہ مشاغل کے لئے زبرون کی چڑھائی پر بنوایا تھا۔ یہاں تصوف کی کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ بھی جمع کیا گیا تھا۔ اب یہ ویران ہے۔ تاہم اس کے نام کا حُسن شاعروں کی فکر کے لئے مہمیز رہا ہے۔

محلات اور مدرسوں کے علاوہ اسلامی عہد میں کئی مسجدیں، مقبرے اور خانقاہیں تعمیر ہوئی تھیں۔ جن میں سے اب بھی کئی باقی ہیں۔ ان تعمیروں میں شاہ ہمدان کی مسجد اور خانقاہِ معلیٰ، جامع مسجد، حضرت بل کی مسجد، اخوند ملا شاہ کی مسجد سلطان زین العابدین کا گنبد، حضرت مخدوم شیخ حمزہ کا مقبرہ، قابلِ ذکر ہیں۔

ا۔ صحیح نام زبرون ہے۔

خانقاہِ معلیٰ اپنے تقدس اور قدامت کے علاوہ تعمیر کاری کے عمدہ نمونے کے طور پر یادگار ہے۔ جامع مسجد، دنیا کی وسیع ترین مسقف عمارت مانی جاتی ہے۔ پتھر کی مسجد، جو تراشے ہوئے پتھروں سے نورجہاں کے حکم سے ۱۶۲۰ء میں بنائی گئی تھی۔ دریائے جہلم کے کنارے بڑے اچھے مقام پر واقع ہے۔ حضرت بل کی مسجد ڈل کے کنارے ایک وسیع پُرفضا باغ میں، شاہ جہاں نے بنوائی تھی۔ یہاں موئے مبارکؐ کی زیارت بھی ہے۔ اخوند مُلّا شاہ کی مسجد ہاری پربت پر بنائی گئی ہے اور اسی سے قریب مخدوم حضرت شیخ حمزہؒ کا مقبرہ بھی ہے۔

مغل باغات

مغل باغات، کشمیر میں مغل دورِ حکومت کی دین ہیں اور یہ باغات کشمیر کی تعمیر کاری کے علاوہ اس کی ثقافت کا بھی ایک جُز بن گئے ہیں۔ مغل حکمرانوں کو باغات کا شوق اور ذوق تھا۔ لال قلعہ میں انہوں نے ایک وسیع باغ لگوایا تھا اور مصنوعی آبشار بنوائے تھے۔ اس کے علاوہ اس مقصد کے لئے ان کو جو مقام بھی پسند آیا، وہاں باغات لگوائے۔ لیکن ان کی حُسن پسند نظر کے درخور، کشمیر سے بہتر کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہاں قدرتی چشموں اور سر بفلک پہاڑوں کے پس منظر میں، اپنے ذوق کے موزون باغات بنوانے کے لئے کئی گوشے مل گئے۔ مغل حکمرانوں میں جہانگیر کا اور اس سے زیادہ اس کی ملکہ نورجہاں کا ذوق نظر ضرب المثل ہے۔ مغلوں کے سب سے زیادہ دلکش باغ ڈل کے اطراف میں بنوائے گئے ہیں اور ان کے پس منظر میں اونچے پہاڑ ہیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ مغلوں نے ڈل کے اطراف میں سات سو کے قریب باغ لگوائے تھے، لیکن ان میں سے صرف چند باقی رہ گئے ہیں۔ مغلیہ دور کے کچھ ناظموں خاص طور پر ظفر خان احسن نے بھی کئی باغ لگوائے تھے۔ اور

شاہی باغات کی تہذیب اور باز تعمیر بھی کی تھی۔

اچھ بل، جہانگیر نے ۱۶۲۰ء میں تعمیر کروایا تھا۔ اچھ بل کا چشمہ اپنے ماحول کے حُسن کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ یہاں ایک وسیع باغ لگوایا تھا اور بارہ دری بھی بنوائی تھی۔ جہلم کے منبع ویری ناگ کے چشمے کے اطراف بھی جہانگیر ہی نے باغ لگوایا تھا اور بارہ دری بنوائی تھی۔ جو اب ویران ہو گئی ہے۔ شاہ جہاں کو بھی یہ حسین ماحول بہت پسند آیا تھا۔ اور اس نے بھی یہاں کی عمارت میں اضافہ کروایا اور نہروں کی درستی کروائی تھی۔

شالامار آغاز ۱۶۱۹ء میں باغ فرح بخش سے مشہور ہوا تھا۔ جو جہانگیر کے حکم سے بنوایا گیا تھا لیکن اس وقت، باغ کی صورت وہ نہیں تھی، جو اب ہے۔ گیارہ سال بعد شاہ جہاں کے عہد میں ظفر خان احسن نے اس میں توسیع کی تھی اور خوبصورت بارہ دری بنوائی تھی اور اس کا نام باغ فیض بخش رکھا تھا۔ اس کے کئی خطے ہیں۔ درمیان میں نہر بہتی ہے جس میں مصنوعی آبشار بنائے گئے ہیں۔ یہ نہر باغ سے نکل کر ڈل میں جاتی ہے۔ باغ نشاط، وسعت میں شالامار سے کسی قدر کم، لیکن اپنے خطوں اور تنظیم کے لحاظ سے، اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کی تعمیر نور جہاں کے بھائی آصف خان نے کروائی تھی۔ ۱۶۳۳ء میں جب شاہ جہاں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تو اس کی تعریف تین دفعہ کی۔ اور ہونا یہ چاہیئے تھا کہ آصف خان اس سے حضور میں نذر گزران دیتا لیکن آصف خان خاموش رہا۔ اس پر شاہ جہاں نے حکم دیا کہ چشمہ، جس سے شالامار اور باغ نشاط دونوں کو پانی آتا تھا۔ صرف شالامار کے لئے مخصوص رہے۔ اس سے باغ اُجڑ گیا اور اسے دیکھ دیکھ کر آصف خاں کے دِل پر چوٹ لگتی تھی۔ آخر اس کے ایک ملازم سے اپنے آقا کی حالت دیکھی نہ جا سکی اور اس نے چپکے سے جا کر پانی کے راستے سے وہ رُکاوٹ دور کر دی

جو شاہ جہاں کے حکم سے لگا دی گئی تھی۔ آصف خان کو جب یہ حال معلوم ہوا، تو وہ شاہ جہاں کے خوف سے ڈرا، اور پانی کے راستے کو پھر بند کروادیا۔ یہ خبر شاہ جہاں تک پہنچی، لیکن ناراض ہونے کی بجائے، وہ ملازم کی وفاداری سے بہت خوش ہوا اور اسں کو انعام اور آصف خان کو چشمہ کے پانی سے حصہ پانے کی سند عطا کی۔

چشمہ شاہی، زبرون پہاڑ کی ڈھلوان پر ۱۶۴۲ء میں علی مردان خان، ناظم کشمیر نے شاہ جہاں کے حکم سے بنوایا تھا۔ یہ باغ نشاط سے زیادہ مختصر اور کئی خطوں پر مشتمل ہے۔ وہ مختصر مگر نفیس بارہ دریاں بنی ہیں اور چشمہ کا پانی درمیان میں نہر کی شکل میں بہتا ہے، جس میں مصنوعی آبشار بھی ہے ۔۔ یہاں سے ڈل کا نظارہ بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ چشمہ کے پانی کے بڑے خواص بتائے جاتے ہیں۔

شاہ جہاں نے ڈل کے مغربی کنارے پر باغ نسیم بنوایا تھا۔ جو جائے وقوع اور اپنے خوبصورت چناروں کی بدولت دلکشی رکھتا ہے۔ اس باغ میں اب ریجنل انجنیرنگ کالج ہے۔ ڈل کے بیچ میں ایک جزیرے پر شہزادہ مراد نے ۱۶۴۱ء میں ایک مختصر باغ لگوایا تھا لیکن اب باغ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے صرف چار کونوں پر چار چنار باقی ہیں جو خود ایک دلکشی رکھتے ہیں۔ اسوقت وہاں ایک آرام دہ ریسٹورنٹ بنایا گیا ہے۔

تاریخی

جموں و کشمیر کا علاقہ اپنی جغرافیائی تشکیل کی طرح 'تاریخی' اعتبار سے بھی بہت قدیم ہے۔ بعض روایتوں کی رو سے سری رامچندر جی نے کشمیر کو فتح کیا تھا۔ چنانچہ پرگنہ وُتر کے چشموں رام کنڈ، سیتا کنڈ، لچھمن کنڈ اور ہنومان کنڈ کے نام اس کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سری رامچندر کے نام سے ایک مندر بھی وہاں قدیم زمانے میں موجود تھا۔

"معیار الاخبار کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سکندر ذو القرنین کشمیر کے راستے سے چین گیا تھا۔ سکندر فیلقوس کے بارے میں کشمیری مورخین کا بیان ہے کہ اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے جاتے ہوئے برسات کا موسم کشمیر میں گذارا تھا۔

بعض مورخین کے مطابق پانچ ہزار سال قبل مسیح سے کشمیر کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کشمیر ہی ایک ایسی سرزمین ہے جس کے بارے میں کسی نہ کسی طرح کا مواد ما قبل تاریخ زمانہ سے ملتا ہے۔ لیکن ما قبل تاریخ عہد کا جو مواد ملتا ہے، وہ محض حکمرانوں کے سلسلوں کے بارے میں روایات پر مشتمل ہے۔ پنڈت کلہن کی تاریخ "راج ترنگنی"

جو ۱۱۴۹ء میں لکھی گئی، ہندوستان کے تاریخی ادب میں سب سے پہلی تصنیف ہے جو ہماری دسترس میں ہے اور کسی نہ کسی حد تک تاریخ کی صحیح تعریف کے ماتحت بھی آسکتی ہے۔ لیکن خود کلہن پنڈت نے اپنے پیش رو مصنفین سو بھاتا، کشیندر، پدما میہارا، نیلا مت، ہیلا راجا، چھیلا کرا کی تحریروں سے مدد لی تھی، جن کے کارنامے اب دستیاب نہیں ہیں۔

روایت کے مطابق، کشمیر ما قبل تاریخ عہد میں ایک جھیل جس کا نام ستی سر تھا۔ ستی درگا کا لقب ہے اور یہ اس کی سیر گاہ تھی۔ جھیل میں بے شمار پشاچ یا کش اور ناگ بستے تھے۔ ان سب کا سردار ایک خبیث دیو، جمل دیو، جلا بھویا جلو دھر تھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر لوگ آباد تھے، جن کے سردار، خالق کائنات کے پوتے کشپ رشی ایک چوٹی پر محو عبادت رہتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق آبادی جب بڑھ گئی اور لوگوں کو اپنے مویشیوں کے لئے چارہ نہیں ملنے لگا۔ تو انہوں نے وہاں سے پرباس کی ٹھانی اور رشی کو اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ کشپ رشی نے ان کو اپنا وطن چھوڑ کر جانے سے منع کیا اور دیوتا اندر سے زمین کے لئے امداد مانگی۔ اندر نے بارہمولہ کے پہاڑوں میں ہاتھ چلا کر پہاڑوں میں شگاف ڈال دیئے جس سے پانی بہ گیا۔ اور وادی کی زمین نکل آئی۔ اس سرزمین کو پہلے کشیپ مار کہا جاتا تھا۔ پانی کے نکل جانے کے بعد راکشش جمل دیو نے دھواں پیدا کر کے اپنے آپ کو اس میں چھپانا چاہا۔ تب دیوی شاریکا، مینا کے روپ میں، جسے کشمیری میں "ہآر" کہتے ہیں اپنی چونچ میں پہاڑ اٹھا کر لائی اور راکشس پر ڈال دیا۔ راکشس اسی کے نیچے دب کر مر گیا۔ یہ پہاڑ ہاری پربت کہلاتا ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ درو ہین، اپندر اور رودر دیوتاؤں نے کشپ رشی پر رحم کھا کر، زمین میں

سوراخ پیدا کر دیئے جس سے پانی بہہ گیا۔ ایک تیسری روایت یہ ہے کہ کشیپ رشی نے اس جھیل میں عبادت کے لئے زمین مانگی جس پر اشنو نے فرشتوں کو بھیج کر پہاڑوں میں رخنے پیدا کئے۔ ایک اور روایت یہ بھی ملتی ہے کہ وشنو کے بھائی بلبھدرا نے اپنے ہل کو پہاڑیوں میں چلا کر، پانی کی نکاسی کیلئے راستہ بنا دیا۔ اور پھر وشنو نے راکشس کو بھی مارا۔ ماہرین ارضیات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وادی کی زمین سالہا سال زیر آب ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ ان روایات کو بنیاد بنا کر ایک ڈراما اُردو میں "سورگ کی کھوج" کے نام سے لکھا گیا ہے۔ یہ ڈراما شائع ہو چکا ہے۔

ان روایات سے قطع نظر، ریاست جموں و کشمیر کے تاریخی حالات بدھ مت کے عروج کے زمانے سے ملنے لگتے ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں کشمیر گاندھار دیس کا حصہ تھا، جس کا صدر مقام ٹیکسیلا تھا، جو سنسکرت علم و فن کا بڑا اہم مرکز رہا۔ اس علاقے میں زیادہ تر ناگ قوم کے لوگ آباد تھے، جن سے آریوں کی جنگیں ہوئی تھیں۔ ناگ قوم کے علمائے نے سنسکرت زبان اور علوم میں ایسی مہارت پیدا کر لی تھی کہ خود آریہ علماء بھی انہیں ماننے لگے تھے۔ اس عہد کے ناگ علماء میں کپل فلسفی کا نام ٹیکسیلا کے اساتذہ میں سر فہرست ہے۔ اسی تعلق کے سبب سے 'ناگ' کو کشمیر سے ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ پرانی داستانوں میں بار بار آتے ہیں۔ اس کی اچھی مثال داستان " ہی مال و ناگرائے " ہے۔

راجہ اشوک نے اپنے گرو موگلی تپا سا کے مشورے سے مجھنتک نامی بودھ بھکشو کو بدھ مت کے پرچار کے لئے کشمیر بھیجا تھا۔ یہاں اس زمانے میں راجہ اسوک کی حکومت تھی۔ یہ راجہ بہت ظالم تھا۔ اس نے بدھ مت کی مخالفت کی، لیکن عوام

بدھ مت کی طرف مائل ہو گئے اور ہزاروں لوگ بدھ مت کے پیرو ہو گئے۔ راجہ اشوک نے سری نگر شہر آباد کیا[1] اور ملک بھر میں بدھ وہار قائم کئے۔

پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت کی چوتھی مجلس کشمیر ہی میں منعقد ہوئی تھی، جس کے مباحث کے نتیجے کے طور پر بدھ مت کی نئی شاخ مہایان کی بنیاد پڑی۔ یہ راجہ کنشک کا عہد تھا۔ مہایان عقاید کو کشمیر اور وسط ایشیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور کشمیر میں مہایان فلسفہ کے عالم جیسے سدرشن، اشوگھوش، پارشو، اور واسو مِترہ نشوونما پائے۔ ان علما کی تعلیم اور تبلیغ نے بدھ مت، کو چین، ترکستان اور تبت تک پھیلایا۔ لیکن مہایان فرقے کے لوگوں میں جلد ہی اطراف اکناف کے اثر سے بُت پرستی کا رجحان عام ہوتا گیا۔

علم و فن کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بُت تراشی اور تعمیر کاری کا رواج بھی قدیم زمانے سے تھا۔ یہاں کی تعمیر کاری پر گاندھار طرز کا اثر تھا۔ جس کے نمونے پُرہاسپور، پاندریٹھن، اوشکر، ملنگ پورہ، اور شرایان یا ہاردن میں اب بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی زمانے میں ویبھاشا شاستر کی تدوین بھی عمل میں آئی تھی۔

کشمیر میں بُدھ مت کا زوال ہُن راجہ مہرگل کے زمانے سے شروع ہوا۔ جو شیو مذہب کا پیرو تھا۔ وہ بدھ مت کا سخت مخالف تھا اور اس مذہب کے ماننے والوں میں سے لاکھوں کو اس نے قتل کیا اور وہاروں کو مسمار کرایا۔ اس کے بعد راجہ ہرش نے بھی بدھ مذہب کے اثرات کو مٹانے کی کوشش کی۔ جس

---

[1] اشوک نے جو شہر اس نام سے قائم کیا وہ موجودہ سری نگر سے قریب تھا۔
"راج ترنگنی" جلد ۱، صفحہ ۵۔

کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں رفتہ رفتہ بدھ مت کا خاتمہ ہو گیا۔ بدھ مت کے استحصال میں ایک اور بات یہ بھی معاون ہوئی کہ ہندو مذہب کے علما نے بدھ مت کے ساتھ ایک سمجھوتہ کر لیا اور گوتم بدھ کو بھی اپنے بہت سے اوتاروں میں سے وشنو کا ایک اوتار مان کر بدھ مت والوں کو ہندو مذہب میں ضم کرنے کی گنجائش نکال لی۔

راجہ کنشک کے انتقال کے بعد شمالی ہندوستان میں جو افراتفری پھیلی اس کا اثر کشمیر پر اس طرح پڑا کہ چھوٹے چھوٹے سردار خود مختار بن بیٹھے اور پہاڑوں کی بلندیوں پر قلعے یا کوٹ تعمیر کر لئے۔ یہ سردار آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ اس طوائف الملوکی کے عہد کو "کوٹہ راج"[1] سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کے کچھ کوٹ یا قلعے اب بھی باقی ہیں۔ کچھ اور کے نام گاؤں یا محلے کے ناموں کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ جیسے اندر کوٹ، سدرہ کوٹ، پٹہ کوٹ، دور کوٹ، سیالکوٹ وغیرہ۔ لوگ جب ان راجاؤں کے آپسی جھگڑوں سے تنگ آ گئے تو انہوں نے جموں کے راجا سے اس ملک کا انتظام سنبھالنے کی درخواست کی۔ چنانچہ پنڈت کلہن کے مطابق اس راجا سے لے کر جس کا نام دیاکرن تھا۔ راجہ سوم دت تک پچپن راجاؤں نے چھ سو ترین برس تک کشمیر پر حکومت کی۔ راجا سوم دت کوروؤں پانڈوؤں کے معرکے میں مارا گیا اور سرداروں نے آدگونند کو حکومت کے لئے منتخب کیا۔ کلہن کی باضابطہ تاریخ اسی راجہ سے شروع ہوتی ہے۔

آدگونند کے بارے میں بعض مورخوں کا بیان ہے کہ وہ بھی راجگان

---

[1] صحیح لفظ کوٹھہ راج

جموں کی نسل سے تھا۔ لیکن کچھ اور مورخ اسے متھرا کے راجاؤں کے خاندان سے بتاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جب اس راجا کے رشتہ دار راجہ سنھ لنے سری کرشن جی کے مقابلے میں صف آرائی کی تو وہ خود بھی اس کی مدد کو پہنچا اور لڑتے ہوئے قتل ہوگیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا راجہ دامودر تخت پر بیٹھا۔ لیکن بتایا جاتا ہے کہ قندہار کے راجا کی لڑکی کے سوئمبر کے سلسلے میں سری کرشن جی کا مد مقابل ہوا اور مارا گیا۔ اس کے مارے جانے کے بعد اس کی رانی جشومتی نے حکومت سنبھالی اور جب اس کا لڑکا بال گونند بڑا ہوگیا، تو حکومت اس کے سپرد کردی۔

پانڈوں کا خاندان

اس سلسلہ کا پہلا راجا ہران دیو، جسے پنڈت کلہن نے پانڈووں کے خاندان سے بتایا ہے۔ اپنے بھائی جنمہ جی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے بعد ناکام کوہستان کی طرف بھاگ گیا اور ایک عابد مرتاض کی خدمت میں رہنے لگا۔ عابد نے اس کی خدمات سے خوش ہوکر کشمیر کی حکومت کی اسے بشارت دی، یہ خوشخبری سن کر وہ کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ اور بال گونند کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اور رفتہ رفتہ اس کا وزیر اور مدارالمہام بن گیا۔ پھر موقع پاکر اس نے ایک دن راجا بال گونند کو قتل کردیا اور کشمیر کا حکمران بن بیٹھا۔

اس کی اولاد میں کوئی بائیس راجاؤں نے کشمیر میں جہانبانی کی جن کے نام یہ ہیں:- ۱۔ راجا رام ۲۔ راجا بیاس دیو ۳۔ راجا درناے ۴۔ راجا سہم دیو، ۵۔ راجا گوپال چند ۶۔ راجا وزیانند ۷۔ راجا لکھ دیو ۸۔ راجا رامانند ۹۔ راجا سندیکان ۱۰۔ راجا مرہن دیو ۱۱۔ راجا کامن دیو ۱۲۔ راجا چند دیو ۱۳۔ راجا آنند ۱۴۔ راجا درپنا دیو ۱۵۔ راجا ہرنام دیو ۱۶۔ راجا سکھ دیو۔

۱۷۔ راجا سینادت ۱۸۔ راجا منگلادت ۱۹۔ راجا کھیمندر ۲۰۔ راجا بھیم سین۔

۲۱۔ راجا یندرسین ۲۲۔ راجا سندرسین۔

راجا رام دیو کشمیر کا عظیم الشان راجہ مانا جاتا ہے۔ اس نے کریوہ مَن پر ایک شہر بابل آباد کیا تھا اور مارتنڈ کا مندر اسی نے بنوایا تھا۔ راجا سندیان نے کوہستان میں سندمت نگر نامی شہر آباد کیا تھا۔ جس کے بیچوں بیچ دریائے جہلم بہتا تھا۔ اس نے مہا دیو کا مندر بھی بنوایا تھا۔ اس راجا نے کشمیر کی حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصّہ اپنے پاس رکھا اور ایک اپنے بھائی مرہن دیو کے سپرد کیا تھا۔ یہ حصّے بعد میں مراج اور کامراج کے نام سے موسوم ہوئے۔

ورپتا دیو نے موضع شار میں ایک مندر جو الامکھی کے نام کا بنوایا تھا۔ راجا ہرنام دیو بہت عیش پرست اور شراب کا عادی تھا۔ اس نے شراب کی خاطر جگہ جگہ انگور کی بیلیں لگوائی تھیں اور مشہور ہے کہ وہ اپنے محل کے حوض کو شراب سے بھر کر غالب کے مصرع "جو ہوا غرقۂ مَی بخت رسا رکھتا ہے" کا مصداق بنا رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا سلکھن دیو بھی اسی کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ اس کا جانشین سنیادت بڑا خود بین، خود پرست راجا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہر روز آئینہ سامنے رکھ کر گھنٹوں اپنے حسن و جمال کا مشاہدہ کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ ایک دن اس کی رانی پیچھے سے آنکلی تو آئینہ میں اس کا عکس دیکھ کر اس سے ناراض ہو گیا کہ آئینہ میں جو صورت ہے وہ اس پر عاشق ہو گئی ہے۔ اسی وقت رانی کی ناک کاٹ دی اور وزیر کو حکم دیا کہ اس کے لئے سورگ کی اپسرا لائے۔ وزیر نے ایک حسین لڑکی کو لباس فاخرہ پہنا کر اس کے روبرو پیش کیا اور کہا کہ یہ جنت کے داروغہ کی بیٹی ہے۔ راجا اس پر بہت خوش ہوا اور وزیر نے اس کو بیوقوف بنا کر ایک لاکھ دینار وصول کئے۔

منگلادت اور کرن دونوں بھی عیش پرست راجا تھے۔ بھیم سین ظالم

اور فاسق تھا۔ اس نے جہلم کے کنارے کوٹیشور کا مندر بنوایا تھا۔ موضع سمپور اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ سندر سین خود بھی عیش پرست تھا اور اس کی رعایا میں بھی یہ بُرائی عام تھی۔ ایک عابد مرتاض کوزہ گر، اصلاح کے لئے اُٹھا لیکن اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔ آخر ایک سخت زلزلہ آیا، جس سے وولر ناگ کی نہر پیدا ہوئی۔ بارہ مولہ کے پاس کھادنیار اسے زلزلہ کی بدولت ایک پہاڑ لڑھکتا ہوا آیا اور نہر کی راہ میں حایل ہوگیا۔ جس سے پانی جمع ہوکر سارا شہر غرقاب ہوگیا۔ جھیل وُلر کو اسی کی باقیات بتایا جاتا ہے۔

اس خاندان کے راجاؤں نے کوئی ایک ہزار برس کشمیر پر حکومت کی سیلاب کا اثر رفع ہونے کے بعد لو راجا منتخب کیا گیا، یہ راجا مالوہ کے راجاؤں کے خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ اسی نے لولاب بسایا تھا۔ جس کے چشموں کے پانی کو اقبال نے چمکتا ہوا سیماب لکھا ہے۔ اس راجا کا نظم و نسق اچھا تھا۔ اس نے وادی لولاب میں ایک شہر لولو آباد کیا تھا۔ جس کے بارے میں پنڈت کلہن نے لکھا ہے کہ اس کی آبادی ایک لاکھ تھی اور رتناکر کے بیان کے مطابق اس شہر میں اسی ہزار مکانات تھے۔

راجہ لَو کا خاندان

راجہ لَو کے خاندان کے (۲۲) راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی، جن کے نام یہ ہیں :۔

راجا کوشی شی، راجا نگیندر، راجا سریندر، راجا گودر، راجا سورن، راجا جنک، راجا سچی نر، راجا گلندر۔ راجا بلدیو۔ راجا نل سین۔ راجا گوکرن، راجا پرہلاد۔ راجا بمبور۔ راجا پرتاپ شبل۔ راجا شنگرام چند۔ راجا لارک چند۔

راجا بیرم چند۔ راجا بلبکھن۔ راجا بھگونت۔ راجا اشوک۔ راجا حسلوک۔ راجا دامودر۔

کوشی گوشی برہمنوں کا پرستار تھا، موضع کولر کو جو وچھن پارہ میں واقع ہے، اس نے برہمنوں کو جاگیر میں عطا کیا تھا۔ راجا شنگندر نے کاکا پور اور کھونہ موہ آباد کیا تھا۔ راجا سریندر کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس کی لڑکی بہت حسین تھی۔ ایک ایرانی سوداگر اسی زمانے میں کشمیر آیا تھا۔ اس نے راجہ کو بیش قیمت جواہرات پیش کئے۔ لیکن راجہ نے کوئی التفات نہیں کیا۔ اس کی بیٹی کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے سوداگر کو بلوا کر اس کے سارے جواہرات خرید لئے۔ جب وہ ایران واپس گیا تھا تو اس نے شاہ بہمن اسفندیار سے لڑکی کے حسن و جمال کی ایسی تعریف کی کہ وہ لڑکی کا نادیدہ عاشق ہو گیا، اور راجا سریندر کے پاس حکیم طہماسپ کے ذریعہ شادی کا پیام بھجوایا۔ راجا نے اسے منظور کر لیا اور دونوں کی شادی رچائی گئی۔

راجا گودر، ایک دوسرے خاندان سے بتایا جاتا ہے، اسے مندروں کی یاترا کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہندوستان کے مشہور مندروں کی زیارت کی اور واپس کشمیر لوٹنے کے بعد کوہ ماران پر شارکا دیوی کا مندر بنوایا تھا، جس کے لئے موضع برنڈ وقف کیا تھا۔ راجہ پرہلاد نے شیرہ کوٹ میں مندر برتی شور تعمیر کروایا تھا۔ ایک فقیر کی محبت کے اثر سے وہ نظم و نسق اپنے وزیر بمبور کے سپرد کرکے، خود گوشہ گزیں ہو گیا تھا۔ بمبور خود راجہ بن بیٹھا۔ راجہ کو اپنے چچا زاد بھائی کی بیوی لولری سے عشق ہو گیا جس کے فراق میں وہ عاشقانہ اشعار پڑھتا جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس کی زبان پر شب و روز لولو کا نام جاری رہتا۔ اسی سے کشمیری سرود لولو، لولری اور بمبر مشہور ہوئے۔ اسی حالت میں راجا کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس کے عشق کا اثر لولری پر ایسا ہوا کہ وہ بھی اپنے عاشق

کی موت کی خبر سُن کر جان بحق ہو گئی۔

اس کے مرنے کے بعد عمایدین نے پرتاپ شیل کو راجا منتخب کیا۔ اس نے کوہ اُلر کے دامن میں ایک شہر پرتاپ نگر آباد کیا تھا۔ اور مچھ بون میں پرنا پیشور کا مندر بھی اسی نے بنوایا تھا۔ روایت یہ ہے کہ ایک جادوگرنی اس راجا پر عاشق ہو گئی تھی اور سنگ سالگرام کی طرح اسے بغل میں دبوچ کر غایب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سنگرام چند، راجا ہوا اور سنگرام پور موضع اسی نے آباد کیا۔ اس نے صرف ایک سال چار مہینے حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بھائی لارک چند نے حکومت سنبھالی وتر گنگ پہاڑ کے دامن میں لار پرگنہ اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اس نے لارک نگر شہر بھی بسایا تھا اور نہر لاری اس کی بنوائی ہوئی ہے۔

راجا بیرم چند بڑا مذہبی آدمی تھا۔ ہر صبح مندروں میں پوجا کے لئے جاتا اور لوٹتے ہوئے، غریبوں اور مسکینوں کو خیرات دیتا آتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن جب وہ خیرات کر کے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں اُسے ایک برہمن ملا۔ جس نے سوال کیا۔ راجا نے کہا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، کل جو تو مانگے گا میں تجھے دوں گا۔ راجا کے اس جواب پر برہمن نے کہا کہ کل تک تیری عمر نے وفا نہیں کی تو کس سے مانگوں گا۔ اس پر راجا نے کہا۔ اچھا مجھے لے جا اور بازار میں فروخت کر کے جو کچھ ملے، لے لے۔ برہمن راجا کو بازار میں لے گیا۔ وہاں ایک سوداگر نے راجا کو پہچان لیا۔ ایک ہزار اشرفی دے کر اسے برہمن سے خرید لیا۔ رات کو راجا سوداگر کے گھر میں رہا۔ صبح ایک ہزار اشرفی منگوا کر اسے دینا چاہا۔ سوداگر بچے نے کہا، تجھ جیسے راجا کو خریدا ہے، اگر تو ایک ہزار کیا، دس ہزار لاکھ اشرفی بھی دے تو کون قبول کرتا ہے۔ راجا نے پوچھا آخر تو کیا

چاہتا ہے۔ سوداگر نے کہا، میری یہ خواہش ہے کہ جب تک میں جیتا رہوں۔ تو ہر روز رات کا کھانا میرے گھر تناول کرے۔ راجا نے مجبوراً یہ شرط قبول کرلی۔

راجا بیکیھن، عادل راجا تھا۔ اس کی رانی چکرہ رانی رات کو فقیروں کا لباس پہن کر شہر کے دورہ کو نکلتی تھی، ایک رات اس کا گذر نزدیک شہر ندانہ کی طرف ہوا۔ وہاں ایک عابد مرتاض اور اس کی بیوی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ بیوی کہہ رہی تھی کہ چکرہ رانی بڑی دلاور ہے لیکن وہ راتوں کو مردانہ لباس پہن کر مردوں کی طرح شب گردی کرتی ہے۔ اگر یہ مرد ہوتی اور اس کا مرد، عورت تو کتنا اچھا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی رانی میں مردوں کی علامتیں پیدا ہوگئیں۔ وہ پریشان ہوکر عابد کے پاس گئی اور منت سماجت کی، لیکن عابد نے کہا یہ شدنی تھی، جا تیرا شوہر عورت ہوگیا ہے۔ رانی جب محل لوٹی تو دیکھا کہ راجا ایک خوبصورت عورت بنا بیٹھا ہے۔ رانی نے سارا قصہ اسے سنایا۔ راجا کو ایسا قلق ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کرلی اور زہر کھاکر جان دے دی۔ رانی عابد کی خدمت کرتی رہی۔

راجا اشوک اس خاندان کا وہ مشہور راجہ تھا۔ جس نے بدھ مت اختیار کیا اور اس مذہب کو پھیلانے کی سعی بلیغ کی۔ اس نے ہندو مندروں کو مسمار کرکے، بدھ وہار بنوائے، لیکن اس کے جانشین راجا جلوک نے پھر ہندو مذہب قبول کرلیا اور شیو عقاید کو پھیلایا۔ کئی مندر بنوائے جن میں وزیر ایشری اور نندہ کشور کے مندر قابل ذکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ ناگ اس کے مسخر تھے۔ اور ناگ پر سوار ہوکر جہاں چاہتا جاتا رہتا تھا۔

راجہ دامودر۔ اس سلسلے کا آخری بادشاہ تھا، جس نے کریوہ دامودر پر اپنی راجدھانی لبائی تھی۔ کشمیر کے مورخین کے بیان کے مطابق، اس راجہ کے

زمانے میں ایک شخص سندیمان نامی، جو ملک مغرب سے آیا تھا، اپنی ریاضت سے ایسے مرتبہ پر پہنچ گیا تھا کہ وحشی جانور، پرند اور جن اس کے تابع فرمان ہو گئے تھے۔ اور وہ ہوا پر سیر کرتا تھا لیکن مسلم مورخین کا بیان ہے کہ یہ حضرت سلیمان تھے، جو سیر کرتے ہوئے کشمیر بھی آگئے تھے اور کوہ جیٹ لارک کی چوٹی پر رُکے تھے۔ چنانچہ یہ چوٹی تختِ سلیمان کے نام سے موسوم ہوئی۔ جہاں اب شنکر آچاریہ کا مندر ہے اس لئے شنکر اچاری پہاڑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پہاڑی سری نگر شہر میں واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ سندیمان یا سلیمان کے کے ہمراہ ترکستان کے تین شہزادے، ہشک، کنشک، اور زشک بھی تھے۔ جب وہ کشمیر سے لوٹے تو انہوں نے کشمیر کی حکومت ان تینوں کو عطا کی۔ کوئی چالیس سال تک یہ تینوں یہاں حکومت کرتے رہے۔ موضع اشکورہ، ہشک کا، کانسپورہ، کنشک کا اور ذکرو، زشک کے بسائے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔

کشمیر میں شاکیہ منی کی مساعی سے بدھ مت کی جو اشاعت ہوئی تھی۔ اس کے مرکز شاکیہ منی کے متبعین میں سے ایک چیلے ناگ سین نے قایم کئے تھے۔ برہمنوں نے ان کی مخالفت شروع کی تو دونوں فرقوں میں سخت تصادم ہوا۔ جسے تینوں بھائی رفع نہ کر سکے۔ اس لئے برہمنوں نے بیرم چند کی اولاد سے ایک شخص ابھی مینو کو جو دچھن پارہ کا جاگیردار تھا۔ کشمیر کی حکومت کے لئے منتخب کیا۔ اس نے بدھ مت کا قلع قمع کیا۔ مشہور قواعد نویس، چندراچارج جو "مہابھاشیہ" کا مصنف تھا۔ اسی زمانے میں ہوا ہے۔ اس کی تبلیغ کی بدولت کشمیر سے بدھ مت تقریباً بالکل مفقود ہو گیا۔ بعض مورخ اسی کو "نیلامت پران" کا بھی مصنف سمجھتے ہیں۔ جو کشمیر کے پنڈتوں کی مقدس کتاب ہے۔

ابھی مینو خاندان کے بعد راجا گونند سوم کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ وہ بدھ مت کا مخالف تھا اور نیلامت پران کے ماننے والوں میں سے تھا۔ اس خاندان کے اٹھائیس راجاؤں نے حکومت کی، جن کے نام یہ ہیں:۔

راجا وبِھِیشن، راجا اندرجیت، راجا راون۔ راجا وبھیشن دوم۔ راجا نر۔ راجا سدھ۔ راجا روت پلاک۔ راجا ہری ناکھ۔ راجا ہرینہ کُل۔ راجا وسرکل۔ راجا مہرہ کل۔ راجا بک۔ راجا کتھی نند۔ راجا وسانند۔ راجا اچھ۔ راجا گوپا دت۔ راجا گوکرن۔ راجا نرندر دت۔ راجا اندجدھشٹر۔ راجا پرتاپ دت۔ راجا نونجین۔ راجا بجی۔ راجا جی اندر۔ راجا سندیمان۔

راجا نر، بدھ مذہب کا مخالف تھا اور اس نے بدھ مت کے مندروں کو جلاکر مسمار کر دیا تھا۔ بودھوں سے اس کی مخالفت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک بودھ بھکشو نے کچھ ایسا عمل سیکھ لیا تھا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا اور گھروں میں جاکر عورتوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے رانی کے ساتھ بھی یہی کیا۔ جس پر راجا نے غضب ناک ہوکر سارے بودھ مندروں کو مسمار کر دینے کا حکم دیا اور بودھ لوگوں کی جاگیریں چھین کر برہمنوں کو دے دیں۔

مہر کُل ہن راجا تھا۔ اس کے زمانے میں ترکستان کے حکمرانوں نے کشمیر پر حملہ کیا تھا، لیکن راجا نے اسے پسپا کر دیا۔ اس کے ظلم و ستم کے قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب وہ مہم سے لوٹ رہا تھا۔ پیر پنچال کی چوٹی پر سے ایک ہاتھی لڑھک کر نیچے گرا، اس کا کرب سے چنگھاڑنا راجا کو ایسا پسند آگیا کہ اس نے ایک سو ہاتھیوں کو اسی طرح پہاڑ کی چوٹی سے گروایا اور ان کے

چیخنے چلانے سے لطف اُٹھاتا رہا۔ راجہ اندھ جدھشٹر کی آنکھیں اتنی چھوٹی تھیں کہ وہ "اندھ" مشہور ہوگیا تھا۔ "رتناگر" کے مصنف کا بیان ہے کہ سکندر کا حملہ کشمیر پر اسی راجا کے عہد میں ہوا تھا۔

ابھینو کے خاندان کے آخری راجا سندیمان المعروف آریہ راج کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سنیاسی ہوگیا تھا اور اس کے بعد کشمیر کی حکومت میگواہن خاندان میں منتقل ہوگئی۔ اس خاندان کے دو راجاؤں سرلشٹہ سین اور اُجاہرن نے حکومت کی۔ راجا ہرن کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے اس کے مرنے کے بعد اعیانِ مملکت نے ہندوستان کے راجہ بکرماجیت سے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کی درخواست کی۔ اسطرح بکرماجیت کا تسلّط کشمیر پر ہوگیا اور اس کے سلسلے کے چودہ راجاؤں نے حکومت کی۔ بکرماجیت جس کے عروج سے بکرمی سنہ رواج پایا، بڑا مُدبّر اور بہادر راجا تھا۔ سلسلہ کے آخری راجا، بالادت کے مرنے کے بعد جس نے جیانند کا لقب اختیار کیا تھا، اس کا داماد، دُرلب وردھن، تختِ کشمیر کا وارث ہوا۔ اس کے وارثِ تخت ہونے کے سلسلے میں عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے مورخین کا بیان ہے کہ جیانند کی لڑکی اننت لیکھا بڑی حسین تھی۔ منجموں نے اس کے بارے میں راجا کو یہ بتایا تھا کہ یہ لڑکی تمہارے خاندان کا خاتمہ کرے گی، اور اس کا شوہر تخت پر بیٹھے گا۔ راجا نے یہ سوچ کر کہ یہ حوصلہ کسی نیچ قوم کے آدمی میں نہ ہوسکے گا۔ اس لڑکی کا بیاہ اپنے اصطبل کے داروغہ کے لڑکے دُرلب وردھن سے کر دیا تھا۔ یہی دُرلبھ وردھن، جیانند کے بعد کشمیر کا راجا ہوا۔ اس سے جو خاندان چلا، کارکوٹ بنی خاندان کہلاتا ہے۔

پنڈت کلہن کی "راج ترنگنی" کا تاریخی اور بڑی حد تک مستند حصہ

اس خاندان کے حالات سے شروع ہوتا ہے۔

کارکوٹ بنی خاندان

دُرولبھ وردھن کی حکومت کا آغاز ۶۲۷ء سے ہوتا ہے۔ اس خاندان کے سولہ[16] راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی۔ ان میں سے اکثر راجاؤں کے بارے میں بہت سے فسانے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً للتا دت مکتا پیڈ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے پنجاب، دہلی، بنگالہ، گجرات، مالوہ، اُجین، کابل، ہرات، خراساں، بخارا، سمرقند بلکہ سنگلدیپ کو بھی فتح کرلیا تھا۔ اور ان ملکوں سے عالموں اور صناعوں کو لاکر کشمیر میں بسایا تھا۔ اس نے پریہ پٹن پر مارتنڈ کے مندر کی ترمیم پر بہت سا روپیہ بھی صرف کیا تھا۔ راجا ادت پلا پیڈ، اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جسے قتل کردیا گیا۔ اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد خارما خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔

اُس خاندان کا پہلا راجا اونتی ورما یا اونتی ورمن علم وفن کا سرپرست تھا۔ پنڈت رتناکر مشہور کشمیری مؤرخ اور "رتناکر پران" کا مصنف اسی کے عہد میں گذرا ہے۔ اسی عہد میں پنڈت کلٹ نے "شیو پران" تصنیف کی جس سے کشمیر میں شیو مذہب کی اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ اونتی پور جس کے کھنڈر سرینگر جموں کی شاہراہ پر واقع ہیں۔ اُسی راجا کا بنوایا ہوا ہے۔ شنکر ورما فاتح راجا تھا، اس نے شہر شنکر پٹن بسایا تھا جو اب پٹن کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کا آخری راجا شبر ورما تھا، جسے اعیانِ حکومت نے دو مہینے کے اندر ہی معزول کردیا اور یشسکر کو تخت پر بٹھایا جو ایک اگلے راجا پسند ... کی اولاد میں سے تھا۔ پوشنکر خاندان کی حکومت اٹھارہ انیس سال رہی اور اس عرصہ میں تو ... راجا

ہوئے۔ پوشکر خود برہمنوں کا بڑا معتقد تھا۔ اس خاندان کے راجا کھمبہ کرن کی ایک عجیب عادت بیان کی جاتی ہے۔ وہ خود اور اپنے مصاحبین کو عورتوں کا لباس پہنکر بہت خوش ہوتا تھا۔ دید رانی نے کچھ زیادہ عرصہ تک حکومت کی لیکن حالات اپنے موافق نہ دیکھے تو حکومت اپنے بھتیجے سنگرام راج کے سپرد کردی۔

سنگرام راج کے خاندان کے بائیس راجاؤں نے جہاں بانی کی۔ سنگرام راج کے عہد میں سلطان محمود نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ اصل میں ۱۰۱۵ء میں لاہور کے راجا آنند پال کے بیٹے ترلوچن پال کے تعاقب میں وہ کشمیر آیا تھا۔ لیکن سنگرام راج نے اُسے تحفے تحایف دے کر خوش خوش غزنین لوٹا دیا۔ اس کے نو برس بعد محمود راجا نندا پر حملہ کرنے کے لئے لوہر کوٹ تک آیا تھا، لیکن راجا نندا نے اس کی خدمت میں تحفے تحایف پیش کئے اور سب سے زیادہ جس چیز نے محمود کو متاثر کیا وہ یہ تھا کہ اس نے سلطان محمود کی شان میں ایک شعر ہندی میں کہہ کر پیش کیا تھا۔ اس پر محمود اتنا خوش ہوا کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کئے بغیر چلا گیا۔

محمود غزنین جاتے ہوئے ایک کشمیری پنڈت تلک کو اپنے ساتھ لیتا گیا تھا جو سنسکرت اور ہندوستان کی زبانیں جانتا تھا اور فارسی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ وہ محمود کے دربار میں مترجم کا کام انجام دیتا تھا۔

سنگرام خاندان کے بارہویں راجا، جے سنگھ کے عہد میں ایک عالمی اہمیت کا واقعہ ترکستان سے مغلوں اور چنگیز خان کا خروج تھا۔ مغل فوجوں سے جے سنگھ کا مقابلہ دریائے نیلاب کے کنارہ ہوا۔ لیکن معاملہ صلح پر ختم ہوگیا۔ بائیسواں راجا سہم دیو تھا۔ جس کا عہد مذہبی اور سیاسی اعتبار سے ایک نئے عہد کا آغاز بن گیا۔ اس زمانے میں شنکر آچاریہ کی تبلیغ کے نتیجے کے طور پر بدھ مت کا اثر کشمیر سے جاتا رہا۔ آخری راجا سہم دیو کے زمانے میں شاہ طاہر کے بیٹے شاہ میرزا

پاشاہ میر، والی تبت کا بیٹا رینچن اور ہندوستان کا ایک مرزا شنکر چک کشمیر آئے۔ اور راجا کی ملازمت اختیار کی لیکن حکومت کی کمزوریوں نے پہلے رینچن شاہ کی اور بعد میں شاہ میر کی مدد کی، اور شاہ میر نے کشمیر میں اپنی حکومت قائم کی

اصل میں کشمیر اب رفتہ رفتہ عالمی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ اس کا آغاز سلطان محمود سے ہو چکا تھا۔ اس کے عرصہ بعد ۱۳۲۰ء میں ہلاکو خان کی اولاد میں ذوالقدر خان، جسے اہل کشمیر ذولچو کے نام سے موسوم کرتے ہیں، بھاری فوج کے ساتھ ترکستان سے آیا اور کشمیر پر حملہ آور ہوا اور بہت کچھ جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ راجا سہہ دیو میں مقابلے کی تاب نہیں تھی اس لئے وہ کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا تھا۔

اس کے ایک سال بعد کہستان قبیلے کے لوگوں نے کشمیر پر ظلم و زیادتی شروع کی۔ رینچن اور شاہ میر نے حکمت عملی سے اس فتنہ کو رفع کیا اور رینچن شاہ نے خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور شاہ میرزا کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس نے تخت پر اپنے دعوی مضبوط کرنے کے لئے سہہ دیو کے وزیر رامچندر کی بیٹی، کوٹارانی سے شادی کر لی۔

رینچن شاہ بدھ مت کا پیرو تھا لیکن اس کے عقائد میں تذبذب پیدا ہو گیا تھا۔ جب ہندوؤں کی سازشوں کا اسے اندازہ ہوا تو وہ ہندو مذہب کا ایسا مخالف ہو گیا کہ ایک دن نراش ہو کر قسم کھائی کہ کل صبح سب سے پہلے جس شخص پر میری نظر پڑے گی، میں اسی کا مذہب اختیار کر لوں گا۔ کہتے ہیں کہ دوسرے دن صبح کو سب سے پہلے جس بزرگ پر اس کی نظر پڑی، وہ سید شرف الدین عبدالرحمن بلبل شاہ تھے، جو دریائے جہلم کے کنارے مصلّی بچھائے نماز میں مشغول تھے۔ رینچن ان کے خشوع خضوع اور طریق عبادت سے ایسا متاثر ہوا کہ اپنے عہد کے مطابق آپ کے ہاتھ پر اسلام لایا۔ اسلام لانے کے بعد اس کا نام صدر الدین رکھا گیا۔ اس نے ۱۳۲۰ء تک

سے لے کر ۱۳۲۷ بکرمی تک دو سال سات مہینے حکومت کی۔ ہندوؤں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے اس نے انہیں بہت نقصان پہنچایا۔[۵] بلبل شاہ کے لئے اس نے خانقاہ بنوائی اور بلبل لنگر تعمیر کروایا۔ کوٹارانی کے بھائی راون کو اس نے وزیر کے عہدہ پر مامور کیا اور "رینہ" کا خطاب دیا۔ کوٹارانی کے بطن سے رینچن کو ایک لڑکا ہوا جس کا نام حیدر تھا۔ صدر الدین رینچن شاہ کے انتقال کے بعد راجا سہدیو کا بھائی اُدین دیو، جو ذولچو کے حملے کے وقت پکھلی کی طرف بھاگ گیا تھا، رینچن شاہ کے انتقال کے بعد کوٹارانی اور شاہ میر نے اسے کشمیر بُلا کر تخت و تاج پیش کیا۔ اُدین دیو نے کوٹارانی سے شادی کر لی۔ شاہ میرزا کو اس نے اپنا سپہ سالار بنایا۔ ۱۳۳۱ سنہ بکرمی میں اچلا (جیسا کہ بازنی نے لکھا ہے) نامی ایک ترکی سردار نے کشمیر پر حملہ کیا۔ اُدین دیو یہ خبر سنتے ہی تبت کی طرف فرار ہو گیا۔ تاہم شاہ میرزا نے سرداروں کو غیرت دلائی اور مقابلہ کر کے ترکی سردار کو پسپا کر دیا۔ اس فتنے کے فرو ہونے کے بعد اُدین دیو جب کشمیر لوٹا تو حکومت میں شاہ میرزا کو اس قدر دخیل پایا کہ نظم و نسق سے دست کش ہونا ہی اس نے بھلا جانا۔ اور کچھ دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

۱۳۳۰ سنہ ب میں راجا کے انتقال کے بعد کوٹارانی یا کوٹن نے اندرکوٹ جا کر اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ لیکن مشکل سے پچاس دن حکومت کرنے پائی۔ اس نے شاہ میرزا کے مقابلے میں اپنے دوسرے لڑکے کے ولی، بھکشن بھٹ کو ترجیح دینی شروع کی۔ اس پر شاہ میرزا مشتبہ ہو گیا اور ترکیب سے بھکشن بھٹ کو قتل کر دیا۔ شاہ میر

۵۔ صحیح تاریخ ۲۲ - ۱۳۲۹ بکرمی
۲۔ اس ... برتی ... نہیں ملتا کہ شاہ میر نے ہندوؤں کے ساتھ ... بہت ... (م ی ش)

نے شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ اور ۱۳۳۹ء میں حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شہمیری عہد

شمس الدین کی ایک اصلاح یہ تھی کہ کشمیر میں جو پرانا سنہ ہفت رکھبشراں رائج تھا، اُسے منسوخ کر کے کشمیری سنہ کا آغاز کیا جو صدر الدین رینچن شاہ کی تخت نشینی یعنی ۱۳۲۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ شہمیری سلسلہ کے ۱۸ بادشاہوں نے قریب سوا دو سو برس کشمیر پر حکومت کی۔ اس عرصہ میں کشمیر میں ایک کشمیری ایرانی تہذیب کی نشو و نما ہوئی۔ جس کی زیریں تہہ میں بدھ مت تہذیب کے عناصر بھی کارفرما ہیں۔ اس تہذیب اور شائستگی کی زبان فارسی تھی اور اس زبان اور اس کے ادب کو کشمیر میں بہت فروغ ہوا، اس کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان بھی نشو و نما کے ابتدائی مراحل طے کرنے لگی۔ چنانچہ کشمیری کے اولین شعراء صوفی نورالدین رشی اور للہ دید نے اسی زمانے میں نغمہ سرائی کی۔ شمس الدین رعایا میں بہت مقبول تھا، اور اس نے بڑے سلیقہ سے حکومت کی۔ اس خاندان کے کل ۲۵ بادشاہ ہوئے۔ ان میں سلطان زین العابدین جو بڈشاہ کے محبوب لقب سے مشہور رہے سب سے زیادہ بیدار مغز بادشاہ گذرا ہے۔

سلطان شمس الدین شاہ میر کا انتقال ۱۳۴۲ء میں ہوا، اس کے انتقال کے بعد اس خاندان کی تاریخ میں ایک مذموم رسم یہ پڑ گئی کہ ابتداء ہی سے جانشینی کے سلسلے میں کشمکش ہونے لگی۔ چنانچہ سلطان جمشید کی تخت نشینی کے بعد ہی علی شیر نے بغاوت کی اور دوسرے ہی سال علاؤ الدین کے لقب سے عنانِ حکومت سنبھالی اور بارہ برس حکومت کی۔ شہمیری خاندان کو عروج کی سمت لے جانے والا پہلا بادشاہ علاؤ الدین کا بیٹا سلطان شہاب الدین تھا۔ جس نے اپنی قوت بازو سے ہمسایہ علاقوں کو متحد کیا۔ وہ اچھا سپاہی بھی تھا اور مدبر بھی۔

ل۔ صحیح تاریخ ۱۳۲۰ء

اس نے مدرسے قائم کئے اور انصاف رسانی کے لئے عدالتیں قائم کیں۔ قاضیوں کی رہنمائی کے لئے اس نے "فتاویٰ شہابیہ" مرتب کرایا۔ سلطان شہاب الدین کے عہد کا اہم واقعہ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کا کشمیر میں ورود ہے۔ آپ کی تبلیغ اور عمل کے نتیجے کے طور پر کشمیر میں اسلام بہت جلد پھیل گیا۔ آپ نہ صرف عالم اور مذہبی پیشوا تھے بلکہ سماجی اصلاح کا بھی سرچشمہ تھے۔ چنانچہ آپ کے مشورے سے سلطان نے بہت سی سماجی اصلاحیں کیں اور اسلامی لباس رائج کیا۔

سلطان شہاب الدین کا جانشین اس کا بھائی قطب الدین ہوا اور اُس نے چوبیس برس حکومت کی۔ وہ عالم تھا اور عالموں کا قدر دان۔ قطب الدین پورہ اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ جہاں اس نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ۱۳۸۹ء میں سلطان سکندر تخت نشین ہوا۔ وہ پابندِ شرع تھا۔ اس لئے ہندو رعایا اس سے بدظن تھی، اور اسی لئے وہ بدنام بھی ہے[1] اس کی تخت نشینی کے مادے " بہ شرع دادہ رواج " سے سکندر کی شرع پرستی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ سکندر کے بُت شکنی کے قصے بھی مشہور ہیں۔ وہ طاقتور حکمراں تھا۔ اور علم سے بھی اسے لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس کی علم دوستی کا شہرہ سُن کر عراق، خراساں، ماوراالنہر غرض سارے اطراف و اکناف سے علماء کشمیر آتے اور حسبِ مراتب فیض پاتے تھے۔

سلطان سکندر کے عہد میں حضرتِ امیر کبیر سید علی ہمدانی کے فرزند حضرت سید محمد ہمدانی اپنے تین سو رفقاء کے ہمراہ کشمیر آئے۔ عالموں اور مقدس ہستیوں کی اُس تعداد کے آنے کا کشمیر پر وہی اثر ہوا، جو دیوگری (دکن) میں حضرتِ نظام الدین اولیاؓ کے خلفاء کے تشریف لے جانے اور قیام کا ہوا تھا۔ آپ کے قیام سے کشمیر میں مذہبی، علمی اور تہذیبی روایات کی نشو و نما ہوئی۔ کشمیری مورخین نے سکندر کے عہد کے

[1] اس سلسلے میں تازہ تحقیق سے نظر ہو دوست [illegible] ہے۔

ایک اہم سیاسی واقعہ امیر تیمور کے خروج کا تذکرہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے، سکندر نے اپنی دانشمندی سے اس فتنے کو کشمیر سے دور نیلاب کے اُس پار ہی سے اطاعت کیشی کے اظہار اور تحفے تحائف کی پیش کشی کے ذریعے رفع کر دیا۔ لیکن حال کے مورخین اس واقعہ کو بے بنیاد بتلاتے ہیں۔ سکندر کو تعمیر سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ سری نگر کی جامع مسجد اور بیجبہاڑہ کی جامع مسجد اس کے شوقِ تعمیر کی یادگار ہیں۔

سکندر کی وفات ۱۴۱۶ء[1] میں ہوئی۔ اور اس کا بیٹا علی شاہ اس کا جانشین ہوا لیکن وہ محض شاہِ شطرنج تھا۔ بساطِ سلطنت پر ملک سیف الدین[2] تھا اور وہی ساری چالیں چلتا تھا۔ چھ سال نو مہینے تک وہ برائے نام بادشاہ رہا۔ آخر اپنے بیٹے شاہی خاں زین العابدین کے لئے جگہ خالی کر دی۔

سلطان زین العابدین نے ۱۴۲۲ء سے ۱۴۷۴ء[3] تک اکیاون برس جہاں بانی کی، اور اس آن بان سے کی کہ خاندانِ شہمیریہ کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز بادشاہ بن گیا تھا۔ فنِ سپہ گری اور نظم و نسق دونوں میں اس کی تربیت اچھی ہوئی تھی۔ اس کی کامرانیوں کا میدان کشمیر میں، نظم و نسق کے استحکام، علم و فضل کی توسیع اور ترقی اور شائستہ سماجی روایات کے قیام تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ کشمیر سے باہر سرکشوں کی اس نے سرکوبی کی اور نئی فتوحات بھی کیں۔ دارالسلطنت کو زینت دینے کے لئے نئی عمارتیں بنوائیں۔ نوشہرہ اور زینہ پورہ اسی کے آباد کئے ہوئے ہیں۔ سلطان کو علم و ادب سے جو لگاؤ تھا، اس کی بدولت کشمیر علماء اور فضلاء کا مرکز بن گیا تھا۔

اس عہد کے مشائخین میں مُلا بہاؤ الدین گنج بخش، سید ناصر الدین بیہقی، سید حسین منطقی، مُلا کبیر اور خاص طور پر شیخ نور الدین ریشی بڑے صاحبِ کمال بزرگ ہوئے ہیں۔ سید حسین منطقی اور مُلا کبیر کے آگے سلطان نے زانوئے شاگردی

---

[1] صحیح تاریخ وفات ۱۴۱۳ء ہے۔ [2] عرف سہ بٹ ہے۔ [3] صحیح تاریخیں ۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء ہیں۔

ترجمہ کیا تھا۔

سلطان کی علوم و فنون کے درمیان سے زبانوں کی دیواروں کو ڈھانے کی مساعی قابلِ قدر تھیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا جس میں "جوگ بشسٹ" "راج ترنگنی" اور "مہابھارت" کو فارسی میں اور فارسی عربی کے علوم و فنون کی کتابوں کو سنسکرت میں منتقل کیا جانے لگا۔ ڈوگرا عہد میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جب دارالترجمہ قائم کیا تو اس کا کام بھی انہی خطوط پر انجام پایا تھا۔ پنڈت جونراج نے "راج ترنگنی" کا تکملہ لکھکر سلسلۂ تاریخی کو سلطان کے عہد تک پہنچایا تھا۔ اس کے عہد کے ایک ماہر موسیقی پنڈت بودی بٹ نے موسیقی پر ایک کتاب تصنیف کی تھی اور سلطان کے حالات پر ایک ناٹک "زینہ چرت" کے نام سے لکھا تھا۔ حکیم منصور کی مشہور کتاب "الطب" "کفایہ منصوری" اسی کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ پیر غلام حسین کوہہامی مصنف "تاریخ حسن" کا بیان ہے کہ "سلطان فارسی، ہندی اور تبتی میں بے تکلف بات چیت کر سکتا تھا۔

اس کی سرپرستی کا شہرہ سُن کر بہت سے ہندو خاندان کشمیر آئے تھے جن میں "کول" اور "در" خاص طور پر نمایاں تھے۔ جو پنڈت دفتری خدمات پر مامور تھے۔ وہ "کارکن" کہلاتے تھے۔ اور جو مذہبی مشاغل میں مصروف رہتے وہ "باچھ بٹ" سے موسوم تھے۔ کشمیر کے کسی اور حکمران کے آثار اس سرزمین پر ایسے ثبت نہیں ہیں جیسے اس بادشاہ کے جسے رعایا گولکنڈہ کے "تانا شاہ" کی طرح "بڈشاہ" یا بڑے بادشاہ کے محبوب نام سے یاد کرتی تھی۔ زینہ کدل کے علاوہ اس کے عالی شان محل زینہ ڈب، کے نام ابھی باقی ہیں اور زینہ گیر، زینہ پور، زینہ پٹن، زینہ منٹھ، زینہ تلک، زینہ گام، زینہ کوٹ، زینہ بازار، زینہ لنک، سونا لنک[1] جیسے کتنے ہی ناموں کے ساتھ اس کی یادگاریں موجود ہیں۔

---

[1] یہ تقابل کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ سرہندی صاحب غلطی سے "سونہ لنک" کو ایک سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ زینہ لنک جھیل ولر اور سونہ (سونا) لنک جھیل ڈل میں واقع ہے۔

ہند میں اس وقت لودھی خاندان کی حکومت تھی اور سلطان بہلول اس زمانے میں تختِ دہلی پر متمکن تھا۔

سلطان زین العابدین کا آخری زمانہ اس کے بیٹوں کی بے صبری، بغاوت، اور آپس کی لڑائی کی وجہ سے بہت ہی بدمزہ رہا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حاجی خان حیدر شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ تخت تو اس کو مل گیا، لیکن باپ کے محاسن اور اوصاف کی جگہ خالی رہی۔ ہر دم متغیر سیاست کی سرزمین میں ایک طاقتور پادشاہ کی حکمرانی کے فوراً بعد ایک نااہل کا عنانِ حکومت ہاتھ میں لینا انجام کا آغاز ثابت ہوا۔ اس کی بے اعتدال زندگی کا خاتمہ جلد ہی ہوگیا۔ اور سلطان حسن شاہ نے ۱۴۷۲ء میں حکومت سنبھالی اور سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن عمایدین سلطنت کی آپس کی تخریبی سرگرمیوں نے اسے قومی تعمیر کے کاموں کا موقع ہی نہیں دیا اور اسے بھی سلطنت کے بے مزہ کاموں سے منہ موڑ کر راگ و رنگ میں اپنے حوصلے نکالنے کی راہ سجھائی۔ کہتے ہیں کہ اس نے ہندوستان سے بارہ سو گویوں کو طلب کر کے اپنے دربار میں ملازم رکھا تھا۔ کشمیر میں شیعہ عقائد کی اشاعت میر شمس الدین عراقی سے ہوئی جو اسی زمانے میں کشمیر آئے اور زڈی بل (جڈی بل) میں ایک خانقاہ "نوربخشیہ" تعمیر کی۔ ان کے ورود اور ان کی تبلیغ سے، کشمیر کی مذہبی اور اجتماعی زندگی میں ایک نئی ہل چل کا آغاز ہوا اور بعد میں منافشات اور فسادات کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ میر عراقی اچھے عالم تھے اور ان کے ساتھ ایرانی تہذیب اور شائستگی کی نئی رو اور شائستہ روایات کشمیر پہنچی تھیں۔

۱۴۸۴ء میں حسن شاہ کا نابالغ بیٹا محمد شاہ، تخت نشین ہوا تو مشکل سے دو اڑھائی سال چین سے بیٹھ سکا ہوگا کہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے پوتے فتح شاہ نے فوج کشی کر کے اسے سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ اس طرح یہ

دونوں ایک دوسرے کو زیر وزبر کرتے رہے۔ اسی زمانے میں محمد شاہ نے سکندر لودھی سے
بھی مدد طلب کی تھی۔ وہ کوئی چھ مہینے برسر اقتدار رہا، پھر اس کا لڑکا ابراہیم تخت نشین
ہوا۔ آخر پانچویں دفعہ پھر محمد شاہ کو کامیابی ہوئی۔ اصل میں یہ امراء کی قوت آزمائیوں
کے کرشمے تھے۔ ایسے بادشاہ گر نالایق حکمرانوں سے شہ پاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی
سید بھائیوں نے اسی طرح پادشاہ گری کے کرتب دکھائے ہیں۔ اس پادشاہ گری
کے کھیل میں چک خاندان کو ابھرنے کا موقع مل گیا، جہانگیر پڈر جو وزیر اعظم تھا۔ کاجی
چک اور شنقار رینہ نے روز روز کے انقلابات سے تنگ آکر اس پر سمجھوتہ کرلیا کہ
اقتدار کے لئے وقفے کا انتظار کون کرے، ہم سب ساتھ ساتھ حکمرانی کیوں نہ کرنے
لگیں۔ چنانچہ اس طرح ملک کے حصے بخرے کئے گئے اور کشمیر کی حکومت کو پانچ امیروں
نے چار حصوں میں بانٹ لیا۔ اور ایک حصے پر کاجی چک حکمران ہوگیا۔ دوسرے حصہ
پر ابدال ماگرے، تیسرے حصے پر لوہر ماگرے، چوتھے حصے پر ریگی چک اور پانچویں
پر علی رینہ، یہ صورت حال بیرونی حملے کے لئے بہت کچھ مساعد تھی۔ چنانچہ بابر جس
نے ہندوستان پر اپنا تسلط قایم کیا تھا۔ کشمیر پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کاجی چک
اور بعض اور سرداروں نے باہر کی فوجوں کا مقابلہ کیا اور انہیں جہلم کو عبور کرنے کے
بعد پھر پسپا کردیا۔ لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

علی رینہ اور ابراہیم ماگرے بابر کے دربار میں پہنچ کر مدد کے طالب ہوئے
اور بابری افواج کی مدد سے پانچویں دفعہ ۱۵۲۹ء میں محمد شاہ کو بادشاہ بنایا۔ اس
دفعہ اس نے کوئی آٹھ برس تک حکومت کی۔[۱]

۱۵۳۲ء[۲] میں ہمایوں کے بھائی میرزا کامران نے محرم بیگ کی کمان میں کشمیر
میں فوجیں بھیجیں۔ محرم بیگ کو زیادہ کامیابی تو نہ ہوئی۔ پھر بھی تحفے تحایف
لے کر وہ لوٹا۔ اس کے ایک سال بعد کاشغر کے حکمران سلطان سعید خاں نے اپنے

[۱] یہ بیان صحیح نہیں ہے اصل میں بابر کے دربار میں جانے والا [illegible] بلکہ ابدال ماگرے تھا۔ وہ اپنے ساتھ
مغل فوج لایا اور کاجی چک کو شکست دے کر [illegible]

بیٹے، سکندر خاں اور چچیرے بھائی مرزا حیدر دوغلات کو فوج دے کر کشمیر بھیجی۔ محمد شاہ کو دب کر صلح کرنا پڑا۔ اور اپنی بیٹی سکندر خان سے بیاہ دینی پڑی۔

۱۵۲۷ء میں سلطان محمد شاہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا دوسرا بیٹا شمس الدین تخت نشین ہوا۔ ملک کاجی اس کا وزیر تھا۔ لیکن شمس الدین کا انتقال ایک سال کے اندر ہوگیا۔ اس کے بعد اس کے بھائی اسمٰعیل شاہ نے دو سال اور ابراہیم ثانی نے دو سال حکومت کی۔ لیکن امراء کی آپس کے نزاعوں میں کمی نہیں ہوئی۔ اور ماگرے سرداروں نے چکوں سے جو ہزیمت اُٹھاتی تھی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے، ہمایوں سے کشمیر پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ ہمایوں اس زمانے میں شیر شاہ کی بغاوت کی وجہ سے خود پریشان تھا۔ اس لئے مرزا حیدر دوغلات نے فوج لے کر کشمیر پر چڑھائی کی اور سری نگر میں داخل ہوگیا۔ لیکن کشمیری سرداروں کی مخالفت کے باعث اس نے ملک کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔

۱۵۴۰ء میں مرزا حیدر نے فتح شاہ کے بیٹے نازک شاہ کو تخت پر بٹھایا لیکن اقتدار اس کے قبضے میں رہا۔ نازک شاہ نام کے لئے بادشاہ بنا بیٹھا رہا۔

مرزا حیدر کے دورِ اقتدار میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی اور نئی صنعتوں جیسے کاغذ سازی کو رواج دیا۔ ترکی حمام بھی کشمیر میں اس کے زمانے میں سے شروع ہوئے۔ وہ اہل و علم و فضل کا قدر دان بھی تھا۔ لیکن شیعہ اس سے ناراض تھے۔ کچھ اور امراء بھی اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک قصاب کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور اس کے زوال کے بعد چک خاندان کو عروج ہوا۔ چنانچہ ۱۵۵۱ء[۱] میں دولت چک نے سلطان نازک شاہ

---

[۱]: صحیح تاریخ ۱۵۵۲ء

کو معزول کر کے ابراہیم شاہ کے بیٹے اسمٰعیل شاہ ثانی[1] کو تخت پر بٹھایا۔ اور خود اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس نے شیعہ مذہب کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی۔ دولتِ چک کے بھائی غازی چک نے، اقتدار کی ہوس میں دولت چک کو قتل کر دیا[2]۔ اور اسمٰعیل شاہ اوّل کے بیٹے حبیب شاہ کو جو اس کا بھائی تھا۔ ۱۵۵۳ء میں تخت نشین کیا[3]۔ اور سارا اقتدار خود اپنے ہاتھ میں رکھا۔ پھر حکومت کی ہوس نے اُسے اتنا بے چین کیا کہ اپنے بھائی کو نام کا سُلطان رکھنا بھی اسے بار ہو گیا اور حبیب شاہ کو معزول کر کے، خود تختِ کشمیر پر متمکن ہو گیا۔ اس کے حکومت ہاتھ میں لینے سے شہمیری خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور چک خاندان اپنے نئے عقاید، نئے طریقوں کے ساتھ، اپنے اطراف کے زوال آمادہ عناصر کو سمیٹ کر نئے سِلسلے کے اقتدار کو مستحکم کرنے پر کمر بستہ ہو گیا۔

چک خاندان

چک خاندان کی حکومت کشمیر پر ۳۲ سال رہی۔ اس عرصہ میں آٹھ حکمران

لہ ۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ نازک شاہ کو تخت سے اتارنے کے بعد ابراہیم شاہ جو محمد شاہ کا بیٹا تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ (ملاحظہ کیجئے: کشمیر سلاطین کے عہد میں)

KASHMIR UNDER SOLTANS" P. 146. L. 7. محب الحسن

ٹہ ۔ یہ واقع غلط ہے۔ غازی چک نے دولت چک کو اندھا کر دیا تھا۔

ملاحظہ کیجئے: ا۔

"KASAMIR UNDER SULTANS"

سہ ۔ یہ واقعات صحیح نہیں۔ غازی چک نے پہلے ابراہیم شاہ کو تخت سے برطرف کر کے اس کے بھائی اسمٰعیل کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد جب اس کا انتقال ہو گیا تو حبیب شاہ کو بادشاہ بنا دیا۔

تختِ کشمیر پر بیٹھے۔ غازی چک نے ۱۵۵۴ء سے ۱۵۶۳ء[1] تک حکومت کی۔ شیعہ مذہب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اس نے سلطنت کی سکڑی ہوئی سرحدوں کو کچھ پھیلایا بھی اور لداخ، اسکردو، گلگت، کشتواڑ، پونچھ، چھبال اور پکھلی کے علاقے فتح کر کے اس نے سلطنت میں جوڑے۔ وہ عدل و انصاف کو بھی پیشِ نظر رکھتا تھا۔ لیکن مذہبی معاملات میں غلو کی وجہ سے اکثر عمائد اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ چنانچہ مغل سرداروں، ابوالمعالی اور قرا بہادر کی پشت پناہی پر کئی بغاوتیں بھی ہوئیں۔ جنہیں کچل دیا گیا۔ لیکن اس سے مسائل حل نہیں ہوئے۔ حضرت مخدوم حمزہؒ کشمیری، بابا داؤد خاکی اور حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ اس زمانے کے سربرآوردہ علمائیں سے تھے۔ غیر شیعہ عقاید کے لوگوں کو غازی چک کی روش سے جو دُکھ پہنچ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ غازی سے ناراض تھے۔ اتفاق سے غازی کوڑھ میں مبتلا ہو کر بینائی کھو بیٹھا اور حکومت اپنے بھائی حسین چک کے حوالے کی۔

حسین چک جس نے ۱۵۶۳ء سے ۱۵۷۰ء تک حکومت کی۔ علم سے بہرہ رکھتا تھا۔ تاہم اس کے طریقہ کار نے بڑی تعداد کو اس کا مخالف بنا دیا تھا۔ ناچار غیر شیعہ فرقے کے لوگوں کی استمالت کے لئے اس نے علی کوکا کو وزیر مقرر کیا، جو سُنّی عقاید کا پیرو تھا۔ اس نے سُنی عقاید رکھنے والوں کی دلجوئی کی کوشش کی۔ اسی دوران اکبر نے مرزا مقیم کو اپنا سفیر بنا کر کشمیر روانہ کیا۔ مرزا کے ایک ملازم نے غالباً مذہبی منافرت سے شہر کے قاضی اور جامع مسجد کے امام قاضی حبیب اللہ کو قتل کر دیا۔ اس واقعے سے سُنی اور شیعہ فرقے کے لوگوں میں بڑی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ یوں حسین شاہ نے اپنی لڑکی شہزادہ سلیم کو بیاہ دی تھی اور اکبر کی اطاعت قبول کر لی تھی تاہم اس کے طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور لوگ اس کے

۱۔ صحیح تاریخ ہے ۱۵۶۱ء تا ۱۵۶۳ء

مخالف تھے۔ آخر سر برآوردہ لوگ اکبرؔ کے پاس شکایت لے گئے۔

۱۵۷۰ء میں حسین شاہ چک نے حکومت سے دست برداری اختیار کرلی اور اپنے بھائی علی شاہ کو اقتدار تفویض کر دیا۔ علی نے نو برس حکومت کی اور اپنے دونوں پیش رو حکمرانوں کے رویے کی تلافی کی کوشش کی۔ اکبر کی اطاعت بھی قبول کرلی۔ لیکن ۱۵۷۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کے بیٹے یوسف چک اور بھائی ابدال چک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ وزیر سید مبارک خان نے یوسف کی مدد کی اور وہ تخت پر بیٹھا۔

یوسف شاہ عیش پرست انسان تھا۔ وہ فارسی۔ ہندی اور کشمیری میں شعر بھی کہتا تھا۔ حبہ خاتون سے اس کا رومان کشمیر کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب بنا ہوا ہے۔ جس پر ادیبوں اور شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس حسینہ کا اصلی نام زون (چاند) تھا وہ بے حد خوبصورت تھی اس کے علاوہ کشمیری میں شعر بھی موزون کرلیتی تھی اور گانے میں بھی ماہر تھی۔ یوسف شاہ نے اسے دیکھا تو ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ اس کے شوہر سے اسے طلاق دلوائی اور اپنے حرم میں اسے داخل کرلیا۔ پروفیسر محمد مجیب نے اس رومان کو اپنے ڈرامہ "حبہ خاتون" کے ذریعہ امر بنا دیا ہے۔[1]

یوسف شاہ کی عیش پرست طبیعت نے نظم و نسق کی ذمہ داریوں سے اسے غافل رکھا اور ہر طرف بد انتظامی پھیل گئی تو اس نے حکومت سے دست برداری اختیار کرلی اور چھ مہینے سید مبارک خان بیہقی وزیر نے حکومت کی۔ اس عرصہ میں یوسف شاہ نے اپنی بحالی کے لئے اکبر سے مدد طلب کی۔ اکبر نے راجہ مان سنگھ اور میرزا یوسف خاں رضوی کو فوج دے کر یوسف شاہ کے ساتھ روانہ کیا۔ لیکن جب کشمیر کے سرداروں نے خود سلطنت کی پیش کش کی تو مان سنگھ کو اطلاع کئے بغیر

---

[1] سرودی صاحب کی یہ رائے مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ حبہ خاتون کو [illegible] کسی [illegible] کی ضرورت نہیں اور متذکرہ ڈرامے کا مقام خود اردو زبان میں بھی [illegible] ہے۔

چار ہزار فوج کے ساتھ کشمیر چلا آیا۔ اس کے پہنچتے ہی کچھ امیر وعلاے سے بچھڑ گئے تاہم لڑ بھڑ کر یوسف نے ۱۵۸۱ء میں دوبارہ حکومت پر قبضہ کر لیا۔

یوسف کے رویے نے اکبر کو اس کا مخالف بنا دیا۔ اس نے یوسف کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ جب یوسف نے جانے میں لیت ولعل کی تو راجا بھگوانداس، شاہ رُخ مرزا اور شاہ قلی خان کو بھاری فوج کے ساتھ کشمیر روانہ کیا۔ یوسف شاہ نے دِل چھوڑ کر مقابلہ کیا اور کچھ برف وباراں کے طوفان نے بھی اس کی مدد کی اور اکبری فوج کا بھاری نقصان ہوا۔ تاہم راجہ بھگوانداس کے کہنے سُننے پر وہ اکبر کے دربار میں چلا گیا۔ اکبر نے اسے کشمیر جانے سے منع کر دیا اور پنج ہزاری منصب دے کر بہار روانہ کر دیا، جہاں اس کا انتقال ہوا۔

عمائدین کشمیر نے ۱۵۸۵ء[1] میں اس کے لڑکے یعقوب کو تخت پر بٹھایا۔ وہ اپنے اسلاف غازی چک اور حسین چک کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ آخر جب لوگ اس کے رویے سے تنگ آگئے تو حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ، بابا داؤد خاکی اور کچھ اور سر برآوردہ اصحاب اکبر کے دربار میں فریاد لے کر گئے۔ اکبر نے چالیس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادہ فوج مرزا قاسم میر بحر کی سرکردگی میں شیخ یعقوب اور بابا داؤد خاکیؒ کے ساتھ روانہ کی۔ شوپیان کے قریب مُغل فوجوں اور یعقوب کی فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ یعقوب کو شکست ہوئی اور وہ کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا اور کشمیر پر مغل فوجوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہاں دہلی سے صوبہ دار مقرر ہو کر آنے لگے۔

---

[1] صحیح تاریخ ہے ۱۵۸۶ء — یوسف شاہ نے فروری ۱۵۸۶ء کو مغلوں کے یہاں پناہ لی۔ KASHMIR UNDER SULTANS. P. 177.

مُغلیہ عہد

کشمیر مغل صوبہ داروں کے انتظام میں ۱۵۸۶ء سے ۱۷۵۲ء تک

ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصہ رہا۔ اور کوئی پچاس کے لگ بھگ ناظم یا صوبہ دار کشمیر کے نظم و نسق کے لئے مقرر ہوکر آئے اور گئے۔ پہلا صوبہ دار یا ناظم قاسم خاں میر بحری مقرر ہوا۔ یعقوب خان چک نے کشتواڑ کے راجا اور بعض امیروں کی امداد سے قاسم خاں سے نبرد آزمائی کی۔ شبخون مار کر ناظم کے محل کو آگ لگادی اور خزانہ لوٹ لیا۔ لیکن عین وقت پر کچھ کشمیری امراء اس سے پھر گئے اور اسے شکست ہوئی۔ ایک اور کوشش اس نے کی اور اس طرح کوئی ڈھائی مہینے تک اپنے تخت، اپنی متاع بُردہ کو قابضوں پر قرض سمجھ کر ان سے چھینے کی کوشش کی آخر تھک ہار کر بیٹھ رہا۔ قاسم خان کے جانشین یوسف خان رضوی (۱۵۸۷ء - ۱۵۹۲ء) کے دور نظامت میں بھی اس نے ایک دفعہ قسمت آزمائی کی، لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ آخر اس نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے میں ہی امان دیکھی، اور یوسف خاں رضوی کی معیت میں اکبر کے دربار میں گیا اور کہتے ہیں کہ دھوکے سے اسے مار دیا گیا۔ میرزا یادگار، جسے کشمیر میں نایب بناکر یوسف خاں اکبر کے دربار میں گیا تھا۔ اس کے غیاب میں لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں پر اتر آیا۔ اکبر نے قاضی نوراللہ شوستری اور قاضی علی کو اراضی کے بندوبست کے لئے بھیجا۔ تو مرزا یادگار نے ان کی مخالفت کی۔ آخر اکبر نے حسین بیگ شیخ عمری کو بھیجا۔ اس نے مغل افسروں کی جاگیریں ضبط کرلی۔ میرزا یادگار اور اس کے ساتھیوں نے بغاوت کردی۔ یہ خبر سن کر خود اکبر جون ۱۵۸۹ء میں کشمیر آیا۔ اور باغی منتشر ہوگئے۔ اکبر نے ہاری پربت، یا کوہِ ماراں پر قلعہ بنوانے اور اطراف میں

شہر آباد کرنے کا حکم دیا، شہر بعد میں ناگر نگر کے نام سے موسوم ہوا۔ اب اس کے شمال مغرب میں بادام واری ہے جہاں ہر سال آغاز بہار میں بادام کے درختوں میں شگوفے کھلنے پر جشنِ شگوفہ بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔

۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہوگیا اور جہانگیر اس کا جانشین ہوا۔ اس عرصہ میں قلیچ خاں، ہاشم خاں، صفدر خاں اور احمد بیگ خاں یکے بعد دیگرے ناظم رہے۔ ۱۶۱۰ء میں سری نگر کی جامع مسجد کی تعمیر ہوئی۔ دلاور خاں ۱۶۱۷ء[1] میں ناظم مقرر ہوکر آیا۔ اس کے دوسرے سال جہانگیر کشمیر آیا۔ اس سے پہلے وہ شہزادگی کے زمانے میں بھی یہاں آچکا تھا۔ اور ویری ناگ میں چشمہ پر عمارت، حوض اور نہر کی تعمیر کا کام جو شروع ہو چکا تھا۔ اس کا معائنہ کیا۔ اچھ بل میں بھی عمارت اور نہر تعمیر کرنے کا حکم دیا اور شاہ جہاں کو شالامار باغ کی تعمیر کی ہدایت دے کر واپس گیا۔ جامع مسجد اس زمانے میں آگ لگنے سے خاکستر ہوگئی تھی، اس کی تعمیر کا بھی حکم دیا۔ دلاور خاں نے محلہ کلاشں پورہ میں ایک باغ بھی بنوایا تھا۔ اب اس میں، سرکاری اسکول ہے۔

۱۶۱۹ء میں ارادت خاں ناظم ہوکر آیا۔ نادہ پورہ کا باغ اور محل اسی کے زمانے کی تعمیریں ہیں۔ اعتقاد خاں جو ۱۶۲۲ء میں[2] ناظم مقرر ہوا تھا۔ سخت گیر بلکہ ظالم بھی تھا۔ اس نے کشمیر میں کچھ ایسی بدعتوں کا آغاز کیا تھا کہ مغلیہ دور کی عام طور پر شائستہ اندازِ جہانبانی کے لئے وہ شرمناک ہیں۔ ٹیکسوں میں اضافہ، باغوں پر ٹیکس، زعفران پر ناروا ٹیکس غرض اس نے اودھم مچا دی تھی۔ تاہم یہ اس کا شخصی فعل تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اس کی دادرسی ہوئی۔ جس کی شہادت

---

[2] اعتقاد خاں ۱۰۳۱ھ میں گورنر مقرر ہوا۔ (تاریخ حسن جلد دوم ص ۴۸)

جامع مسجد کے کتبے پر کندہ ہوئی موجود ہے۔

کشمیر سے جہانگیر کو ایسی محبت تھی کہ جب وہ تیسری بار کشمیر آیا تو ۱۶۲۶ء میں یہاں سے لوٹتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح کو کشمیر کی مفارقت ناگوار ہوئی اور تھنہ واقع راجوری کے قریب اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ لیکن یہ خبر پوشیدہ رکھی گئی۔ چنگس پہنچ کر اس کی آنتیں سرائے میں دفن کی گئیں اور لاش دہلی پہنچائی گئی۔ ۱۶۲۷ء میں شاہ جہاں کی تخت نشینی عمل میں آئی۔

شاہ جہاں نے ۱۶۳۳ء میں اعتقاد کو ہٹا کر ظفر خان احسن کو ناظم بنا کر بھیجا۔ احسن کو کشمیریوں سے ہمدردی تھی اس نے معروضہ پیش کر کے بہت سے غیر ضروری محاصل کی تنسیخ کروائی۔ احسن بڑا جری سپاہی اور سپہ سالار تھا تبت کی فتح کا سہرا اسی کے سر ہے۔ نظم و نسق کا بھی وہ ماہر تھا۔ اسے بھی دراصل کشمیر سے عشق تھا۔ اس نے اہلِ کشمیر کی مشکلات کو دور کرنے کی امکان بھر کوشش کی اور ان میں ہر دلعزیز بھی تھا۔ وہ فارسی کا اچھا شاعر تھا اور ایک دیوان اور کئی مثنویوں کا مصنف ہے۔ وہ فارسی کے سر برآوردہ شعرا جیسے صائب، قدسی، کلیم، میر الٰہی اور بہت سے علماء کا سرپرست تھا۔ شعر و سخن کے اس ذوق کو، جو سلاطین کشمیر کے عہد میں شروع ہو چکا تھا، اس نے بہت ترقی دی اور اس سرزمین کو ایرانِ صغیر بنا دیا۔ کشمیر کے بارے میں کچھ اچھی مثنویاں اسی کی اور اس کے درباری شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ شعری محفلوں یا مشاعروں کا رواج کشمیر میں اسی کی وجہ سے ہوا۔ ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے، جہاں تک مذہبی عقاید کا تعلق ہے، وہ

لہ۔ شاہ جہاں نے ۱۶۳۲ء میں ابوالحسن تربتی کو گورنر مقرر کیا اور اس کے بیٹے ظفر خان کو اس کا قائم مقام بنا کر کشمیر روانہ کیا۔

ٹہ۔ دہلی صحیح نہیں بلکہ لاہور جہاں جہانگیر دفن ہے۔

شیعوں کی طرفداری کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کے زمانے میں فسادات برپا ہوئے۔

احسن دو دفعہ کشمیر بھیجا گیا۔ پہلی دفعہ ۱۶۴۱ء میں شاہزادہ مراد بخش کو جائزہ دینے کے بعد اس نے ۱۶۴۴ء[1] میں علی مرداں خاں سے دوبارہ نظامت کشمیر کا جائزہ لیا۔ اس نے بہت سے باغ اور محل بنوائے۔ باغ الٰہی، باغ عیش آباد جو حضرت بل کے قریب واقع ہے، باغ عنایت وغیرہ اسی کے بنوائے ہوئے ہیں۔

اس کا لڑکا عنایت خاں آشنا دہلی میں کچھ عرصہ برسر خدمت رہنے کے بعد کشمیر ہی میں آکر فرد کش گیا تھا۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔ وہ بھی صاحب دیوان تھا۔ ۱۶۴۵ء میں شاہ جہاں کے ورودِ کشمیر کے موقع پر احسن نے اپنی مثنوی "ہفت منزل" پیش کی تھی۔ اس نے دو تین مزید مثنویاں بھی لکھی ہیں۔

۱۶۴۷ء میں تربیت خاں ناظم ہو کر آیا۔ اس کے زمانے میں کشمیر میں سخت قحط پڑا۔ جس کی مصیبت کو دور کرنے کے لئے شاہ جہاں نے اناج بھجوانے اور لنگر کھولنے کا انتظام کیا۔ خود بھی مالی امداد کی اور امرا سے بھی امداد دلوائی۔ علی مردان خاں نیا ناظم ۱۶۵۱ء میں دوسری دفعہ کشمیر آیا۔ اس نے تیل بل کے قریب باغ علی آباد اور نوشہرہ کے قریب باغ حیدر آباد بنوایا تھا۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ راجوری سے لے کر کشمیر تک سڑک کی تعمیر ہے۔ اس کے زمانے میں پنڈت مہادیو کے گھر کو جہاں اس نے ناجائز طور پر غلّہ فراہم کر رکھا تھا۔ آگ لگانے کا جو واقعہ پیش آیا تھا اس پر شاہ جہاں نے خاطیوں سے سخت باز پرس کی تھی۔ اس کی پاداش میں تربیت خان تبدیل کر دیا گیا اور لشکر خاں ۱۶۵۷ء میں ناظم بنا کر بھیجا گیا۔ اس کے انتظام سے غلہ سستا ہوا اور لوگ آسودہ حال ہوئے۔

اسی زمانے میں شاہ جہاں کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ بڑا بیٹا دارا شکوہ جس کو کشمیر سے بڑا انس تھا اور اپنی علمی، ادبی اور صوفیانہ دلچسپیوں کی

[1] صحیح تاریخ ۱۶۴۱ء بادشاہ نامہ حصہ ۳۳ دوئم ص ۴۸۲

نشو ونما کے لئے اس نے اسی جگہ کو منتخب کیا تھا اور پیر پنچال کے دامن میں چشمہ شاہی کے قریب، کتاب خانے کے لئے عمارت بھی بنوائی تھی۔ جواب پری محل کے نام سے موسوم ہے۔ داراشکوہ اورنگ زیب کے معرکے میں قتل ہوا۔ اور اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو نظر بند کر کے ۱۶۵۸ء میں تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ سری نگر کی جامع مسجد شاہ جہاں کے عہد میں بھی جل گئی تھی اور از سر نو تعمیر کی گئی۔

۱۶۶۴ء میں سیف خان ناظم ہوا۔ وہ بڑا مُنصف اور دیانت دار حاکم تھا۔ لداخ کے راجا کی اس نے سرکوبی کی اور اس علاقے کو بھی مغلیہ حکومت میں شامل کر لیا۔ لداخ کے صدر مقام لیہہ میں اس نے مسجد تعمیر کروائی۔ ڈل کے شمالی رُخ پر اس نے باغ سیف آباد بنوایا تھا۔ یہ دوسرا ناظم تھا۔ جسے شعر و شاعری سے بڑا اُنس تھا۔ اُسے موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۶۷۱ء میں اسے تبدیل کر کے قوام الدین خان اصفہانی کو کشمیر بھیجا گیا۔ ۱۶۷۹ء میں ابراہیم خان دوسری مرتبہ ناظم ہوا۔ اور اس کے بیٹے فدائی خان نے لداخ سے قزاق قبائلیوں کے قبضے کو بے دخل کیا۔ ۱۶۸۲ء میں بڑا سخت شیعہ سُنی فساد برپا ہوا۔ جس پر اورنگ زیب سخت ناخوش ہوا۔ اور حفیظ اللہ خان کو ناظم مقرر کر کے کشمیر بھیجا۔ حفیظ اللہ خان نے جموں کے راجا پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔

فاضل خان جو ۱۶۹۸ء میں ناظم مقرر ہو کر آیا تھا۔ بڑا دیندار حاکم تھا۔ وہ رعایا کا ہمدرد بھی تھا۔ تعمیرات سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ ہفت چنار کا بند، حضرت بل کا باغ، سرائے حسن آباد، جوگی لنگر کی خانقاہ اور کئی اور عمارتیں اسی کی بنوائی ہوئی ہیں۔ حضرت بل کے موئے مبارک کی آمد اسی کے زمانے میں ہوئی۔ ۱۷۰۱ء میں فاضل خان نے خدمت سے استعفیٰ دے دیا اور ابراہیم خان تیسری مرتبہ ناظم ہوا اس کے بعد لطف اللہ خان اور نوازش خان رومی

باری باری سے کشمیر کے ناظم رہے۔ ۱۷۰۷ء میں جب اورنگ زیب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۷۵۲ء تک مغل گورنر کشمیر میں حکومت کرتے رہے لیکن خود دارالسلطنت کی حالت ابتر تھی۔ فرخ سیر کی والدہ "صاحبۂ النسوان" کشمیری تھی۔ اس کے علاوہ مغلوں کی حکومت کا دھرا سامراجی ہوتے ہوئے بھی کشمیر سے ان کے ربط کے کئی نقاط تھے۔ اور شہنشاہوں کا طور طریق عام طور پر منصفانہ رہا۔ ناظم اچھے بھی آئے اور برے بھی۔ نظم و نسق کا انحصار شخصی رجحانِ طبع پر تھا۔ اعتقاد خان جیسے حاکموں سے اہلِ کشمیر کو بڑا دکھ پہنچا۔ لیکن کئی ایسے ناظم بھی آئے جنہوں نے اچھی روایات کی بنیاد ڈالی۔ کشمیر سے اس کی آزادی کا غصب ہونا، ایک تاریخی جبریت کا نتیجہ تھا۔ تاہم ایک مثبت بات یہ ہوئی کہ سرداروں کی آپسی کش مکش میں کشمیر کے عوام جو پسے جا رہے تھے۔ اس سے انہیں کسی حد تک امن نصیب ہوا اور کچھ نئی تہذیبی روایات جاری ہوئیں۔ شال بافی کے علاوہ بعض نئی صنعتیں قائم ہوئیں۔ اکبر نے پشمینہ کی صنعت کی ترقی میں شخصی دلچسپی لی تھی۔ قالین بافی کی صنعت اندجان وسط ایشیا سے درآمد کی گئی تھی۔

علمی اور ادبی اعتبار سے مغلیہ دور میں سلاطین کے عہد کی روایات جاری رہیں اور ہندوستانی عالموں، ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ نئے رجحانات بھی آئے۔ کشمیر کے علماء اور شعراء ہندوستان بھی جانے لگے۔ جس سے ان کے ذہنی افق میں کچھ وسعت کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ ہندوستان میں ہندوستانی یا اردو کے فشار کی صدائے بازگشت بھی اس زمانے سے کشمیر کے فارسی شعراء کے یہاں سنائی دینے لگی۔ لیکن ان لیل و نہار کا کچھ آخر تھا۔ پرانا نظام یہاں بھی بدلا اور نئے نظام کو جگہ ملی۔ مغلوں کی کمزوری اور مغل سرداروں

کے آپسی نزاع نے اقتدار کے تار و پود ایسے بکھیر دیئے کہ آخر کار احمد شاہ درانی نے کشمیر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا جس کے جلو میں ایک نئے عہد نے جنم لیا۔

افغان عہد

وہ عہد جو ۱۷۵۲ء میں افغانوں کے کشمیر پر قبضے کے بعد شروع ہوا۔ اسے بعض وقت دورِ ابتلاء اور بعض وقت دورِ ابتری سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مغل سامراج نے کشمیر کی آزادی چھینی تھی تو کم سے کم ایرانی تہذیب، شائستگی ادب اور علم کی روایات دی تھیں، جن کی چھینٹ افغانوں پر بہت دور کے واسطے سے پڑی تھی۔ وہ جری تھے، بہادر سپاہی تھے، لیکن عوام کی دلبری کے بغیر ان کی شہامت قاہری بن گئی تھی۔

عبداللہ خان ایشک آقاصی افغان فاتح کشمیر پہلا ناظم بنا تھا۔ اس نے ایسی سختی سے کام لیا کہ مورخ لکھتے ہیں کہ ہندی سوداگر جو کشمیر میں کاروبار کر رہے تھے، کاروبار چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد عبداللہ خان کابلی حاکم بنا اور سکھ جیون مل، لاہور کا کھتری اس کا مشیر مقرر ہوا۔ لیکن ایک کشمیری سردار امیر ابوالحسن بانڈے اور سکھ جیون مل نے سازش کر کے، عبداللہ خان اور اس کے دو لڑکوں کو قتل کر دیا۔ اور سکھ جیون مل نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پہلے پہلے سکھ جیون نے انصاف اور رواداری کے ساتھ حکومت کی اسے علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی اور اپنے زمانے کے شعراء کی اس نے سرپرستی بھی کی لیکن جب پنڈت مہانند جو در کو اس نے وزیر مقرر کیا، تو مورخ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ سکھ جیون مل مسلمانوں سے بدظن سا ہو گیا اور پنجاب سے ہزاروں برہمن بلا کر کشمیر میں آباد کئے گئے۔ احمد شاہ ابدالی نے آخر نورالدین خاں بامزئی کو سکھ جیون مل کے خلاف

روانہ کیا۔ سکھ جیون مل کو شکست ہوئی اور وہ کابل بھیج دیا گیا۔ نورالدین بامزئی ایک سال تک کشمیر میں رہا اور افغانستان کے اقتدار کو مستحکم کرتا رہا۔ اس کے بعد بلند خان بامزئی کو حاکم مقرر کرکے وہ کابل واپس ہوا۔ کوئی اٹھائیس افغان ناظموں نے کشمیر پر حکومت کی۔ نورالدین بامزئی بلند خان کے بعد ناظم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں جب وہ کچھ عرصہ کے لئے پنجاب گیا تھا، لال محمد خان خٹک نے بغاوت کردی اور لوٹ مار شروع کردی۔ کوئی چھ مہینے تک یہ افراتفری جاری رہی۔ پھر ۱۷۶۶ء میں خرّم خاں نے آکر اسے رفع کیا۔ اس نیک دل گورنر کے زمانے میں مظفرآباد کے راجا محمد خاں کی مدد سے فقیر اللہ کنہ نے کشمیر پر چڑھائی کی اور خرّم خاں کو شکست دے کر کچھ عرصہ حکومت کرتا رہا۔ آخر نورالدین بامزئی تیسری دفعہ کشمیر کا حاکم بن کر آیا اور لال محمد خان خٹک کو اپنا وزیر مقرر کیا، جس نے سارا اقتدار غصب کرلیا۔ ۱۷۷۰ء میں جب امیر خاں جواں شیر حاکم بن کر آیا تو اس نے سرکش پٹھانوں کی سرکوبی کی، اور امن وامان قایم کیا۔

امیر خاں کو تعمیر کا بھی ذوق تھا۔ چنانچہ امیرا کدل اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ بڈشاہ پل کے مغرب میں جہلم کے کنارے جو سرکاری عمارت شیر گڈھی کے نام سے موسوم ہے وہ بھی اسی کی بنوائی ہوئی ہے۔ جھیل ڈل میں ایک مصنوعی جزیرہ بنوا کر، اس پر اس نے اپنا محل بھی تعمیر کروایا تھا اور نندہ پورہ میں باغ امیرآباد بنوایا تھا۔ زوجیلا درّے پر اس نے فوجی چھاونی بھی قایم کی تھی۔ اس لحاظ سے امیر خاں جواں شیر کا عہد کشمیر کی تاریخ میں یادگار بن گیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کا انتقال اسی زمانہ میں ہوا اور تیمور منظر عام پر آیا۔ اس وقت تک امیر خان نے اپنا موقف اتنا مستحکم کرلیا تھا کہ تیمور نے اکبر خان کو کشمیر کا ناظم مقرر کرکے

بھیجا تو وہ مظفر آباد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آخر تیمور نے حاجی کریم داؤد خاں کو ایک بھاری فوج کے ساتھ بھیجا تو امیر خان نے اطاعت کا پیغام تیمور کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن کشمیر میں بغاوتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ آخر ۱۷۷۶ء[ل] میں حاجی کریم داؤد خان نے حکومت سنبھالی اور امن قائم کیا۔

۱۷۸۳ء میں حاجی کریم داد خان کا انتقال ہو گیا اور کشمیر کی حکومت اس کے بیٹے، آزاد خان نے سنبھالی۔ سکھوں کا عروج اسی زمانے سے ہونے لگا۔ افغان ناظموں میں عطا محمد خان بہت بیدار مغز تھا۔ اس نے رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا۔ وہ حضرت شیخ نورالدین ریشی کا معتقد تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے نام کا سکہ بھی جاری کیا تھا۔ آخر میں وہ بھی خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ لیکن ۱۸۱۲ء میں شاہ محمود کے وزیر فتح محمد خان اور کشمیری پنڈت بیربل در نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملہ کرنے کی شہہ دی۔ اس موقع پر رنجیت سنگھ کو پوری کامیابی نہ ہوئی، لیکن اس سے سکھوں کی مداخلت کا راستہ کھل گیا اور ۱۸۱۹ء تک سکھوں کا قبضہ کشمیر پر ہو گیا۔ آخر افغان ناظم جس نے کشمیر پر حکومت کی۔ جبار خاں تھا۔ جس نے سکھوں کے مقابلہ میں شوپیان کے مقام پر شکست کھائی۔

سکھوں کا دور

سکھوں کا تسلط کشمیر پر کوئی تیس برس رہا۔ اس عرصے میں گیارہ ناظموں نے کشمیر پر حکومت کی۔ پہلا ناظم دیوان مہر چند تھا۔ جس نے کشمیریوں اور افغانوں کی فوجی طاقت توڑنے اور سکھ اقتدار کو مستحکم کرنے میں اپنی ساری توجہ صرف کی۔ اس کے بعد موتی رام ناظم ہوا۔ اس کے عہد میں پنڈت

[ل]: صحیح تاریخ ۱۷۷۶ء مطابق ۱۱۹۰ھ ہے (تاریخ حسن جلد دوم۔ ص ۶۹۲) [illegible]

بیربل در کو عروج حاصل ہوا۔ جس کے خاندان نے بعد میں کشمیر کی سیاست پر اثر ڈالا۔ موتی رام دو دفعہ ناظم ہوا۔ پہلی دفعہ وہ مشکل سے ایک سال رہا اور اس دوران میں مسلمانوں کو بہت آزار پہنچایا گیا۔ جامع مسجد کو تالا لگا دیا گیا۔ اور اذان کی ممانعت کر دی گئی۔ درمیان میں سردار ہری سنگھ ناظم رہا۔ اور اپنے نام کا سکہ چلایا۔ بیربل در جسے افسر مالیات مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف اسی فرقے کے ایک فرد پنڈت گنیش در نے مخبری کی کہ وہ پہاڑی سرداروں کے ساتھ سازش کر کے سکھ حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتا ہے۔ یہ خبر سُن کر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسے خدمت سے برطرف کر دیا اور اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی۔

سنہ ۱۸۲۲ء میں موتی رام دوبارہ ناظم ہوا[1] اور سنہ ۱۸۲۵ء تک اس عہدہ پر رہا۔ ایک سال دیوان چنی لال نے نظامت کی پھر موتی لال کے بیٹے دیوان کرپا رام کو اس عہدہ پر مامور کیا گیا۔ اس کے زمانے میں زبردست خاں والئے مظفر آباد نے وطن کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

سنہ ۱۸۳۱ء میں سردار بیما سنگھ اردلی کو نظامت ملی۔ اس کے زمانہ کا مشہور واقعہ سید احمد بریلوی اور ان کے رفقاء کے وطن کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش تھی۔ سکھ حکومت کے انگریزوں کی حلیف ہونے کی وجہ سے ان کی جماعت کے جانبازوں نے کشمیر پر بھی حملہ کیا۔ لیکن سید احمد بالاکوٹ کی لڑائی میں شہید ہوئے اور یہ تحریک ماند پڑ گئی۔

راجہ شیر سنگھ اور اس کے بعد کرنل مہان سنگھ بھی تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے کشمیر کے ناظم رہے۔ مہان سنگھ سکھوں کا سب سے زیادہ قابل ناظم تھا جس نے عوام کی فلاح اور بہبود کی کوشش کی۔ اس نے سکھ فوجوں کی

---

[1] صحیح تاریخ سنہ ۱۸۲۱ء مطابق سنہ ۱۲۳۷ھ ہے (تاریخ حسن۔ حصہ دوم ص ۷۶۱)

لوٹ مار کی بھی روک تھام کی کوشش کی۔ اس پر سکھ فوجیوں نے بغاوت کر دی اور ۱۸۴۱ء میں ایک رات اُس کو سوتے میں قتل کر دیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے رنجیت سنگھ نے راجہ گلاب سنگھ کو مقرر کیا۔ جو اس زمانے میں رنجیت سنگھ کی ملازمت میں تھے۔ انہوں نے بغاوت تو فرو کر دی لیکن کشمیر پر تسلّط کا خیال ان کے ذہن میں سما گیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے بعد، جب سکھ سلطنت میں افراتفری پھیل گئی تو سکھ حکومت نے انگریزوں سے بھی بگاڑ لی۔ اور معاہدہ کے خلاف انگریزوں کے مقبوضہ علاقے پر حملہ کر دیا۔ لڑائی میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ اور صُلح نامہ امرتسر کی رو سے مہاراجہ گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپے انگریزوں کو دے کر کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اور اسے جموں کے ساتھ شامل کر کے موجودہ ریاست کی بنیاد رکھی۔

کشمیر میں سکھوں کا دور، افغان عہد سے بھی زیادہ بدنام دور رہا۔ عوام کی بھلائی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور لوٹ مار، استحصال اور بدعنوانیاں اس دور میں عام رہیں۔ کشمیر کے مشہور فارسی شاعر حمید اللہ شاہ آبادی نے سکھوں کے دور میں پریشان حالی، لوٹ مار اور بدعنوانیوں کا خاکہ طنزیہ انداز میں ایک اپنے رسالے "بلبوج نامہ" میں کھینچا ہے۔ اس رسالے کی نظم سے جس کا اقتباس اگلے صفحات میں دیا گیا ہے، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سکھ مذہبی ناروا داری کے لئے کتنے مشہور رہے۔

ڈوگرا عہد

مہاراجہ گلاب سنگھ، جموں کے ڈوگرہ راجپوت حکمرانوں کے خاندان سے تھے۔ جموں کے مورخوں نے، ڈوگرہ خاندان کا سلسلۂ نسب [illegible] رحوی تک پہنچایا ہے۔

اس طرح سورج بنسی اور رگھو بنسی خاندان سے اس کا ناطہ ملتا ہے۔ مہاراجہ سدرشن کا چھوٹا بیٹا اگنی گر بڑے بھائی سے ناراض ہوکر، کوہستان شوالک کی طرف تپ جپ کرنے کے مقصد سے آگیا تھا۔ یہاں نگر کوٹ (کانگڑہ) کے راجہ نے اسے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ اگنی گر نے کٹھوعہ کے چند دیہاتوں پر قبضہ کر کے ایک خود مختار ریاست قایم کرلی تھی۔ اس کی اولاد میں راجہ باہو لوچن گذرا ہے۔ جس نے توی کے کنارے پہاڑی پر قلعہ باہو بنوا کر اطراف میں شہر باہو نگر آباد کیا۔ جموں شہر کا بانی اس کا چھوٹا بھائی جامبو لوچن تھا۔ جو بھائی کے انتقال کے بعد اس علاقے پر حکمرانی کرتا رہا۔

راجا جامبو لوچن اس خاندان کا بانی تھا۔ جس نے شہر جموں آباد کیا تھا۔ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اپنی صید و شکار کی دلچسپیوں کے سلسلے میں ایک دن اس کا گذر توی ندی کے قریب ہوا، تو اس نے دیکھا کہ اس کے گھاٹ پر شیر اور بکری دونوں ایک ساتھ پانی پی رہے ہیں۔ یہ عجب منظر اسے ایسا بھایا کہ توی کے کنارے اس نے ایک شہر آباد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ شہر جموں کے نام سے موسوم ہوا۔ اس علاقے کو یارھویں صدی عیسوی میں چناب اور راوی کے درمیان کی سرزمین میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور اطراف کے پہاڑی راجاؤں نے جموں کے حکمرانوں کی سرداری تسلیم کرلی تھی۔

تیمور کا حملہ اس علاقے پر ۱۳۹۸ء میں ہوا تھا۔ مغل عہد میں جموں کے راجہ نیم خود مختار سے رہے، انہیں اندرونی خود مختاری حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مغل شہنشاہوں کی جانب سے انہیں منصب بھی عطا ہوئے تھے۔ چنانچہ راجہ سنگرام دیو کو جہانگیر نے پندرہ ہزار ذات اور ایک ہزار سوار کا منصب عطا کیا تھا۔ ان راجاؤں کو ضرورت کے وقت فوج سے مدد کرنی

پڑتی تھی۔ عالمگیر کے عہد میں جموں کے راجا نے راجپوتانہ اور دکن کی مہمات میں حصہ لیا اور شہرت حاصل کی تھی۔

راجا رنجیت دیو (۱۷۵۰ء۔۱۷۸۱ء) بیدار مغز حکمران تھا۔ جس کے عہد میں جموں کو اپنے سیاسی موقف، تہذیب، شائستگی، صنعت و حرفت ہر لحاظ سے بڑی ترقی نصیب ہوئی تھی۔ اس نے کشمیر پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہ ہو سکی تھی۔

جس طرح جموں کے راجاؤں کی نظر کشمیر پر لگی ہوئی تھی۔ سکھوں کی طاقت جب بڑھنے لگی تو انہوں نے جموں پر تسلط کا بھی خواب دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ برج راج دیو کے عہد میں جموں کی ریاست، سکھوں کی باج گزار بن گئی تھی۔ پھر ۱۸۰۲ء رنجیت سنگھ نے بھائی حکما سنگھ کی کمان میں فوج بھیجی اور جموں کو فتح کر لیا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ، رنجیت دیو کے بھائی کی اولاد میں سے تھا۔ جس نے سکھ ریاست کی خدمات کے معاوضہ میں جموں کی حکومت حاصل کی تھی اور نئے جموالی خاندان کی بنیاد ۱۸۲۰ء میں رکھی تھی۔ تدبر، سپہ گری اور سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے وہ اپنے زمانے کے پہاڑی سرداروں میں اہمیت رکھتا تھا۔ اتفاق سے اسے زورآور سنگھ کھلوریہ کی ذات میں ایک اچھا جرنیل بھی مل گیا تھا۔ جس کی مدد سے اس نے کشتواڑ اور راجوری کے علاقے فتح کر لئے تھے۔ ان خدمات کے اعتراف میں رنجیت سنگھ نے اسے جموں کی حکومت اور راجہ کا خطاب دیا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد جو افراتفری سکھ سلطنت میں مچی اس کی وجہ سے انگریزی حکومت سے سکھ دربار کی بگاڑ ہو گئی۔ سکھوں نے انگریزی

علاقے پر حملہ کر دیا، لیکن پسپائی ہوئی۔ اس کی پاداش میں انگریزوں نے ایک کروڑ پچاس لاکھ کا تاوان سکھ دربار پر عائد کیا جس کے ادا کرنے کی سکت سکھ حکومت کو نہیں تھی۔ مہارانی جنداں کی تجویز یہ تھی کہ یہ رقم عمائدین حکومت سے چندوں اور عطیوں کی صورت میں جمع کر کے انگریزوں کو دے دی جائے۔ لیکن سکھ حکومت کے سربراہ لال سنگھ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور یہ رائے دی کہ پچاس لاکھ کی رقم خزانے سے انگریزوں کو دے دی جائے اور باقی ایک کروڑ کے لئے کشمیر انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔

جب گلاب سنگھ کو اس کاروبار کی اطلاع ملی تو کشمیر کو حاصل کرنے کی ان کی دیرینہ خواہش دل میں انگڑائیاں لینے لگیں۔ انہوں نے اپنے مربی ہنری لارنس کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ فی الوقت پچھتر[۵] لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہیں۔ اور کشمیر ان کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ معاملہ اس پر طے ہو گیا اور ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں عہدنامہ امرتسر کی رو سے کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا لیکن بعض کاغذات میں یہ رقم اڑسٹھ لاکھ لکھی گئی ہے۔

بہرحال جب معاملت طے پا گئی تو گلاب سنگھ نے وزیر لکھپت اور بیٹوں کو فوج دے کر کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا۔ ادھر لال سنگھ نے کشمیر کے ناظم امام الدین کو خفیہ چٹھی لکھی کہ وہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہ دے۔ چنانچہ امام الدین نے کشمیریوں کی فوج اکٹھا کر کے ڈوگرا فوجوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن انگریزی فوج کی مداخلت کے بعد وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اور گلاب سنگھ کا کشمیر پر تسلط ہو گیا۔ اس سودے بازی پر اقبال نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا۔ ؎

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر میں انتظام کی بحالی کی کوشش کی، لیکن ان کے مقرر کردہ ناظم پنڈت راج کاک کے مظالم کی وجہ سے شال بافوں کی ایک بڑی تعداد نے کشمیر سے ہجرت کر جانے کی ٹھان لی تھی۔ گلاب سنگھ کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے شکایات کی تلافی کا حکم دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد گلاب سنگھ پنجاب اور اس پہاڑی علاقے کے سب سے زیادہ طاقتور حکمران بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سلطنت کے حدود کو اسکردو، لداخ، کشتواڑ، ضلع جہلم اور راولپنڈی کے قریب تک پہنچا دیا تھا۔ اور جموں و کشمیر کی وسیع پہاڑی ریاست کے بانی مبانی ثابت ہوئے۔ ان کے عہد میں ریاست کی وسعت اور ... [illegible] ... لیکن جموں

کے ڈوگرہ علاقے نے جس کی زبان ڈوگری، پنجابی سے قریب اور اردو کی ہم رشتہ زبان ہے۔ ہندوستان سے سیاسی اور ثقافتی تعلقات کے نتیجے کے طور پر جلد ہی اردو کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیئے تھے۔ گلاب سنگھ نے عہد میں استحکام ریاست کی جدوجہد کی وجہ سے، تہذیبی اور ادبی زندگی میں کچھ نمایاں ترقی نہیں ہونے پائی، تاہم جموں اور خاص طور پر کشمیر میں جو فارسی لکھنے والے موجود تھے، انہیں اردو سے بھی واسطہ پڑنے لگا۔ جو اس وقت تک پنجاب اور ہندوستان کے وسیع علاقوں میں پورے قدوقامت کی ادبی زبان کا روپ اختیار کر چکی تھی، اور ولی، میر، غالب، ذوق، مومن، ناسخ، آتش، انیس اور دبیر کے ہاتھوں نشوونما پائے ہوئے فکروفن کی پرچھائیاں ان علاقوں پر بھی گہری پڑنے لگیں۔ میرامن، حیدری اور سرور نے نئی نثر کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ چنانچہ ان کے جانشین مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے کام سے فراغت نصیب ہوئی، تو علم اور ادب کے جو دھارے بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سرچشمے اس سے پہلے پھوٹ چکے تھے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں عنانِ حکومت اپنے بیٹے رنبیر کو سونپ دی تھی۔ اور خود کشمیر میں گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ یہیں ان کا انتقال اگست ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف عوامی جنگ میں انہوں نے فوج اور روپے سے انگریزوں کی مدد کی تھی۔ انگریزوں نے انہیں جو خطوط لکھے تھے، ان میں سے ایک اردو خط میں جو ڈاکٹر کرن سنگھ سابق گورنر ریاست کے مملوکہ ایک مخطوطے میں موجود ہے انگریزوں نے امداد کی اپیل کی ہے۔ گلاب سنگھ کے انتقال کے بعد جب رنبیر سنگھ نے حکمران کی حیثیت سے ریاست کا نظم و نسق سنبھالا۔ تو اس میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ نظم و نسق کے تین شعبے، انتظامی یا معدلت، مالی اور فوجی مقرر کئے۔ ان کے عہد میں جو قانون فوجداری، میکالے کے ہندوستانی

قانونی فوجداری کے نمونے پر بنایا گیا، وہ اُردو میں ہے اور" رنبیر ڈنڈ بدھی" کے نام سے موسوم ہے۔ کشمیر کے ایک اُردو ادیب اور شاعر پنڈت سالگرام سالک نے اس کی شرح بھی لکھی تھی، جس کی کچھ تفصیل بعد کے صفحات میں دی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ نئی تعلیم اور نئی روشنی کا زمانہ تھا۔ جس کا اصول عقلیت پسندی اور جس کا ذریعہ جدید زبانیں تھیں، اور ان میں اُردو سب سے پیش پیش تھی جو مغلیہ عہد کی علمی اور درباری زبان فارسی اور شورسینی پراکرت اور اپ بھرنش کے واسطے سے قدیم ہندوستان کی علمی اور ادبی زبان سنسکرت کے وارثوں میں سے ہے۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد، فارسی جب میدان سے ہٹنے لگی اور عوامی اور ادبی زندگی میں خلا پیدا ہونے لگا تو اردو اس خلاء کو پورا کرنے کے کام آئی۔ تاہم گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کے زمانے تک، فارسی ہی دفتری زبان رہی گو نصاب تعلیم میں یہ زبان داخل ہو چکی تھی اور بعض موقعوں پر ذریعۂ تعلیم بھی بن گئی تھی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے نئی تعلیم کے لئے ریاست بھر میں کئی مدرسے اور پاٹھ شالے قائم کئے تھے، لیکن ان کی توجہ زیادہ تر ہندو مذہبی تعلیم کی طرف تھی جس کے فروغ دینے کے لئے انہوں نے جموں میں رگھوناتھ مندر کے ساتھ ایک پاٹھ شالا قائم کیا تھا۔ اور اس سے ملحق سنسکرت کتابوں اور مخطوطات کا ایک وسیع کتب خانہ بھی قایم کیا تھا۔ جدید علوم سے ریاست کی زبانوں کو روشناس کرانے کے مقصد سے انہوں نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا۔ اس سلسلے میں بھی اُردو نے بڑا حصہ لیا۔ کیونکہ اب وہ ریاست میں تعلیم کا ذریعہ بھی بن چکی تھی۔

رنبیر سنگھ کے دربار کے" نورتن" کا تذکرہ بعض مورخین نے کیا ہے۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے "نورتن" اور اکبر کے دربار کے "نورتن" دونوں میں مماثلت ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان میں دیوان کرپا رام، پنڈت صاحب رام، ڈاکٹر بخشی رام، پنڈت گنیش کول شاستری، حکیم ولی اللہ شاہ، حکیم نور الدین قادیانی، مولوی عبداللہ، مجتہد العصر، مولوی غلام حسن، طالب لکھنوی اور بابو نصر اللہ عیسائی کے خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے فارسی میں لکھا ہے، لیکن وہ اُردو بولتے تھے اور اُردو میں بھی ان کے کارنامے موجود ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کو ریاست کی آمدنی میں اضافہ کرنے کا بڑا خیال تھا۔ اس نے شال کی صنعت کو ترقی دینے کی امکان بھر کوشش کی۔ اس کے علاوہ اطراف کے ملکوں سے تجارتی تعلقات بڑھانے کے مقصد سے اپنی سرکار کے ایک ملازم مہتہ شیر سنگھ کو ان ملکوں کے دورے پر بھی بھیجا تھا۔ مہتہ شیر سنگھ نے سفر سے واپس لوٹنے کے بعد اپنی رپورٹ ایک سفرنامہ کی شکل میں مرتب کی اور مہاراجہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ریاست میں انگور اور چائے کی کاشت کے امکانات بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ لالہ بوتامل نے چائے کی کاشت کی تفصیلات پر ایک رسالہ اُردو میں لکھ کر مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ رنبیر سنگھ کے عہد میں مغربی علوم کی کتابوں کا ریاست کی زبانوں میں جس میں اُردو بھی شامل تھی ترجمہ کرنے کے لئے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا گیا تھا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ان تمام مساعی کے باوجود کشمیر خاص طور پر مصایب کا شکار رہا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں شالبافوں نے بڑی تعداد میں ہجرت کر کے دوسرے پڑوسی ملکوں کو جانے کا ارادہ کیا تھا جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ کے نرم برتاؤ نے اس تحریک کا سدباب کر دیا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد

میں راج کاک کو داغ شال کے محکمہ کا داروغہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کی سخت گیری نے شالبافوں کو منظم طور پر احتجاج کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ۲۹۔ اپریل ۱۸۶۵ء کو شال کے کارخانوں میں کام کرنے والے دستکاروں کا ایک بڑا مجمع اپنی شکایات کے سدباب کے لئے میدان زالڈگر میں جمع ہونے لگا۔ صنعتی کارکنوں اور مزدوروں کی یہ شاید ریاست اور ہندوستان میں پہلی تحریک تھی جسے بظاہر اس وقت کچل دیا گیا، لیکن یہ تحریک دبی نہیں، بلکہ آنے والے ادوار میں نت نئے روپ دھار کر مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں شخصی حکومت کے خلاف آزادی کی تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر میں سخت قحط بھی پڑا تھا۔ یہ ۱۸۷۹-۸۰ء کا واقعہ ہے مہاراجہ نے پنجاب سے غلہ منگوا کر سستے دام فروخت کرنے کا انتظام کیا۔ لیکن عہدہ داروں کی خیانت اور بددیانتی کی وجہ سے عوام کی تکلیفیں رفع نہ ہوئیں۔ بھوکے روٹی مانگنے والے محتاجوں کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ مہاراجہ انہیں بوریوں میں بھر کر، وُلر جھیل میں ڈبو دیتے ہیں۔ آخر انگریزی حکومت کو بھی اس طرف توجہ کرنی پڑی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف مقدمہ کھڑا ہو گیا۔ مہاراجہ کو بڑی اندھیر بتانے کے لئے مہاراجہ کے وفادار عہدہ داروں اور لکھنے والوں کی بڑی جدوجہد جاری رہی۔ انہیں میں سے ایک پنڈت سالگرام سالک بھی تھے، جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ مہاراجہ کی تائید کے لئے سالک نے لاہور اور امرتسر سے اُردو اخبار جاری کئے اور مضامین بھی لکھے تھے۔ ریاست میں اس وقت اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے عرصہ تک اہل کشمیر اور کشمیر سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ قلم ملحقہ شہروں جیسے لاہور، امرتسر وغیرہ سے اخبار نکالتے تھے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا، اور ان کا بڑا بیٹا سری پرتاپ سنگھ گدی پر بیٹھا۔ اور چالیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ درمیان میں کچھ

عرصہ کے لئے اسے حکومت کے کاموں سے سبکدوش بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر اس کے شخصی اختیارات پر روک تھام کے لئے ایک کونسل مقرر کر دی گئی تھی۔ کشمیر کے مشہور شاعر، خواجہ امیر الدین نے اسی موقع پر یہ شعر کہا تھا۔

راجا بیٹھا بھی نہ تھا[1]

سری پرتاپ سنگھ پر روس سے ساز باز کا شبہ ہو گیا تھا۔ اسی راجہ کے عہد میں پہلی دفعہ ریاست میں رزیڈنٹ کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ روس کے خطرہ کی روک تھام کے لئے گلگت کا علاقہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے انتظام میں دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے کونسل ختم کر دی، اور مہاراجہ کو پورے اختیارات دے دیئے گئے۔ مہاراجہ کا بھائی راجہ امر سنگھ، اس کا مخالف ہو گیا تھا۔ اور انگریزوں سے ساز باز کرتا رہتا تھا۔ لیکن ۱۸۹۹ء میں جب امر سنگھ کا انتقال ہو گیا، تو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو چین سے حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ایک کونسل بنائی گئی جس کا صدر خود مہاراجہ تھا۔[2]

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد تک ہی اُردو زبان، عوامی ذریعہ اظہار سے آگے

---

[1] سروری صاحب نے صرف یہی ادھورا مصرعہ نقل کیا ہے۔

[2] یہ واقعات صحیح نہیں ہیں۔ پرتاپ سنگھ کے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں کی کشمیر میں مداخلت شروع ہو گئی اور اصل میں رزیڈنٹ نے ہی حکومت کرنا شروع کر دیا۔ انگریزی حکومت میں اس بہانے سے کہ یہ نظام اچھا نہیں ہے ۱۸۸۶ء میں ایک کونسل قایم کر دی جس کا کرچھمن داس صدر بنایا گیا۔ لیکن اس کی وزارت کامیاب نہیں ہوئی۔ آخر میں مہاراجہ کی بدانتظامیوں کی وجہ سے اس کے تمام اختیارات ۱۸۸۹ء میں لے لئے گئے اور ایک COUNCIL OF REGENCY قایم کر دی گئی۔ اس کا صدر مہاراجہ کا چھوٹا بھائی امر سنگھ بنایا گیا۔

(باقی اگلے صفحہ حاشیہ پر)

بڑھ کر، اس سے بلکہ چہار لسانی ریاست کی مختلف لسانی اکائیوں کے درمیان ایک لازمی رابطہ بن چکی تھی اور ریاست کی سماجی، اجتماعی اور سرکاری زندگی میں اہم خدمت ادا کر رہی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اس حقیقت کو دستوری صورت دینے کے لئے حکومت نے ۱۸۸۹ء میں، اسے سرکاری زبان تسلیم کرلیا۔ چنانچہ اُردو تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں اور عدالتوں کی زبان مان لی گئی[۵]۔

اسی زمانے میں جموں کے ڈوگروں نے ایک ڈوگرا سبھا کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں نے ایک انجمن اسلامیہ قائم کی۔ کشمیر میں بھی انجمن نصرۃ الاسلام مسلمانوں کی تعلیم اور سماجی اصلاح کے مقصد سے قائم کی گئی تھی جس کے سالانہ جلسے انجمن اسلام لاہور کے نمونے پر بڑے شاندار پیمانہ پر منائے جاتے تھے۔ جس میں بعض وقت غیر مسلم قائدین بھی شریک ہوتے اور تقریروں میں حصہ لیتے تھے۔

کشمیر میں سناتن دھرم سبھا بھی قائم تھی، جس کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی حاصل تھی، اور پنڈت سالگرام سالک اس کے معتمد تھے۔ اس سبھا کی کارروائیاں اردو ہی میں انجام پاتی تھیں۔

ان ساری انجمنوں اور اداروں کا بنیادی مقصد، سماجی اصلاح اور تعلیمی ترقی تھا۔ یہ تحریکیں ریاست کی اجتماعی زندگی کے شعور کی ابتدائی مساعی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ریاست میں سیاسی ہل چل کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اس سال ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کشمیر آئے تو کشمیر کے سربرآوردہ تعلیم یافتہ لوگوں نے ایک

(بقیہ صفحہ:) لیکن ۱۹۰۵ء میں کونسل ختم کردی گئی اور مہاراجہ کو پھر اختیارات مل گئے جب ۱۹۰۹ء میں راجہ امر سنگھ کا انتقال ہوگیا تو اس کے بعد سے پرتاپ سنگھ خود مختار ہوگیا۔

[۵] اس سلسلے میں سرور(ی) صاحب نے سند پیش نہیں کی ہے۔

محضر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا جس میں کئی سیاسی اور معاشی مطالبات کئے گئے تھے ان میں کاشتکاروں کو اراضی کے مالکانہ حقوق دیئے جانے، مسجدوں سے حکومت کا قبضہ برخاست کرنے، بیگار کے طریقہ کو غیر قانونی قرار دینے اور مسلمانوں کو سرکاری ملازمت میں مناسب نمائندگی دینے کے مطالبات خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان مطالبات پر مہاراجہ سری پرتاپ بہت ناراض ہو گئے۔ اور محضر پر دستخط کرنے والوں کو ملک بدر کر دیا۔ اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں۔ لیکن یہ مہاراجہ کی ناعاقبت اندیشی تھی، کیونکہ اب عوام میں اپنے حقوق اور ان کی نگہداشت کا شعور پیدا ہو چکا تھا اور یہ تحریک زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ اسی زمانے میں جموں کے لالہ ملک راج صراف کو ریاست کا پہلا عوامی اخبار "رنبیر" ہفتہ وار نکالنے کی اجازت ملی۔

سری پرتاپ سنگھ کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا اور امر سنگھ کا بیٹا ہری سنگھ گدی نشین ہوا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے خود پونچھ کے مہاراجہ کے لڑکے جگت دیو کو متبنیٰ لیا تھا۔ اور اسی کو جانشین بنانا چاہتے تھے۔ لیکن امر سنگھ کی مخالفت کی وجہ سے انہیں اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ گدّی پر بیٹھنے سے پہلے، ہری سنگھ میو کالج، اجمیر میں تعلیم و تربیت حاصل کر چکے تھے اور ڈیرہ ڈون میں فوجی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے بیس برس کی عمر میں انہیں کمانڈر انچیف مقرر کر دیا تھا۔ ریاست کی کونسل کے وہ سینئر رکن بھی رہ چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کی مدد فوج اور روپیہ سے کی تھی۔ ان خدمات کی وجہ سے انگریزی حکومت ان سے بہت خوش تھی۔

مہاراجہ ہری سنگھ کو حالات کا بہتر شعور تھا اور انہوں نے عوام کے حقوق کی نگہداشت اور ریاست کو قحط سے محفوظ رکھنے کی جو کوششیں کی تھیں، ان کی

وجہ سے رعایا کو ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہوگئیں تھیں۔ لیکن جب یہ توقعات پوری نہ ہوسکیں، تو عوام میں ہل چل شروع ہوگئی، جو بالآخر شخصی حکومت کے خلاف جدوجہد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ابتداء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے قانون دادرسی جاری کیا، زمینداری کی اصلاح کی کوشش کی، لازمی ابتدائی تعلیم کے نفاذ اور کمسنی کی شادی کی ممانعت کے قانون بھی پاس کئے۔ لیکن جلد ہی حکومت اور دولت نے انہیں عیش و عشرت کی زندگی کا سلیقہ سکھا دیا اور وہ بھی اکثر رئیسوں کی طرح یورپ کے قیام کو، ریاست کے گوناگوں مسایل سے فرار کا ایک ذریعہ سمجھنے لگے۔ ریاست کے کاروبار مشیروں کے حوالے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ ریاست کے وزیر خارجہ و امور سیاسی، سر ایلبین بنرجی نے حکومت کی بنیادی خرابیوں کے عذر سے اپنی خدمت سے استعفیٰ دے دیا۔

سر بنرجی کے اس بیان نے کہ "ریاست کی کثیر مسلم آبادی جہالت اور غربت اور پس ماندگی کی وجہ سے جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہی ہے۔ عوام اور حکمران میں کوئی رابطہ نہیں اور لوگوں کو اپنی شکایات حکومت تک پہنچانے کا کوئی وسیلہ نہیں، حکومت کی کل فرسودہ ہوگئی ہے اور اسے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ رائے عامہ کو کچل دیا گیا ہے اور پریس کی آزادی کا نام و نشان نہیں ہے" گھر کے بھیدی کی طرح حکومت کے ڈھنکے چھپے عیبوں کو منظر عام پر لا دیا۔ ایک مورخ نے اُسے "آزادی کی پہلی چنگاری" سے تعبیر کیا ہے۔

ہندوستان کے اخبارات نے بنرجی کے بیان کو نمایاں سرخیوں کے ساتھ پیش کیا اور ریاست بھر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی اس سے شہ ملی اور انہیں یقین ہوگیا کہ جب تک اس نظام حکومت کا خاتمہ نہ ہو [illegible] تنظیم، کنبہ پروری، نااہل نوازی اور فرقہ پرستانہ طریقہ کار کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

کشمیر میں اس زمانے میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی ایک تنظیم، ینگ مینس ریڈنگ روم کی صورت میں قایم ہو چکی تھی۔ جس کے مسالے سے آل کشمیری مسلم کانفرنس بعد میں تعمیر ہوئی لیکن اس کے اجلاس ریاست میں ہو نہیں سکتے تھے۔ اس لئے دسمبر ۱۹۳۰ء میں اس کا اہم اجلاس ہوا اور مسایل پر غور و خوض کیا گیا[1]۔ جموں میں بھی غلام حیدر شاہ، قاضی گوہر رحمٰن، اللہ رکھا ساغر، غلام حسین غوری وغیرہ کی جد وجہد سے ریاست میں پہلی سیاسی انجمن، ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ جسمیں غیر ملازم اراکین کے علاوہ کچھ ملازمین بھی چوری چھپے حصہ لیتے تھے[2]۔

سیاسی اتھل پتھل اور حکومت کی جابرانہ روش کے اس دور میں، ایسے اور بھی ادارے قایم ہوئے۔ جن کا مقصد عوام کو اُن کا فطری حق دلانا تھا۔ سرینگر میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے جو ریڈنگ روم پارٹی قائم کی تھی اُس کے روحِ رواں، غلام احمد اشائی اور میر واعظ احمد اللہ تھے[3]۔ احمد اللہ کی وفات کے بعد میر واعظ محمد یوسف شاہ کی تائید بھی اس ادارہ کو حاصل رہی۔ ریاست کی اس فضا نے شیخ محمد عبد اللہ کو بھی اُبھارا۔ یہ صحیح ہے ریاست کے اپنے مخصوص سیاسی اور سماجی مسائل تھے۔ لیکن جموں اور کشمیر میں جو تحریکیں اس زمانے میں شروع ہوئیں، وہ دراصل عالمی اور خصوصی طور پر ہمسایہ علاقوں اور ہندوستان میں برپا تحریکوں کا ردِ عمل تھیں۔

شیخ محمد عبد اللہ جنہوں نے بعد کی ربع صدی میں، جموں اور کشمیر کی سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور رفتہ رفتہ اہلِ کشمیر کے محبوب ترین قاید بن گئے۔ اسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی پاس کر کے آئے تھے اور ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن جوں ہی ان کے رجحان طبع ظاہر ہونے لگے۔ وہ پہلے مذہبی تقریبوں اور پھر سیاسی اجتماعوں میں نمایاں ہونے لگے۔ بالآخر انہوں نے

---

[1] یہ واقعہ کچھ خیالی سا ہے۔ [2] اس تنظیم کے اہم ترین ممبران میں چودھری غلام عباس کا نام لینا فاضل ... [3] ... ریڈنگ روم ... میر واعظ احمد اللہ ... بالواسطہ۔ اس ... رشتہ ...

ملازمت ترک کر کے عوامی تحریکوں کی رہنمائی اختیار کی اور سیاست میں کُھس گئے۔ جلد ہی کئی اور دردمند اُن کی تائید کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، جس میں مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، چودھری غلام عباس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں آزادی کا پرچم بلند ہوا۔ اور جوش و خروش سے یہ تحریک آگے بڑھنے لگی۔ دوسری طرف ذمہ دار حکومت قایم کرنے کی جد وجہد میں حصہ لینے والوں اور محبانِ وطن کو تادیب کے شکنجوں میں کسنے کیلئے حکومت نے بھی اپنے کل پُرزے درست کر لئے۔ آگے چودہ پندرہ برس کی تاریخ کشمیر میں محبانِ وطن اور حکومت کے درمیان کش مکش، تادیب اور استبداد کا دور دورہ رہا۔ ہزاروں انسانوں کو جیل میں ٹھونسا گیا۔ گولیوں کی بوچھار سے سینے چھلنی ہوئے۔ تازیانے کی سزاؤں نے آزادی خواہوں کی کھالیں ادھیڑ دیں، مسجدیں مقفل کر دی گئیں غرض وہ سب کچھ ہوا جو ایک پسپا ہوتی ہوئی شخصی مطلق العنان حکومت اور جاگیرداریت جھنجھلاہٹ میں کر سکتی تھی۔ ظلم و استبداد کی اس ہولناک فضا نے برطانوی حکومتِ ہند کو بھی آخر کار چوکنا کیا اور مہاراجہ کو اپنا دستِ استبداد روکنے اور مسجدوں کی واگذاشت اذان اور نماز پر سے پابندی اُٹھانے مزارعین کی شکایات کی تحقیقات کرانے اور ایک غیر جانبدار برطانوی آئی۔ سی۔ ایس، عہدہ دار کو چیف منسٹر مقرر کرنے پر مجبور کیا۔ ایک مطلق العنان حکومت کے خلاف عوام کی جدوجہد کی یہ پہلی کامیابی تھی۔

کشمیر کی طرح میر پور کے عوام اور خاص طور پر کسانوں کو بھی حکومت کے تظلم کی شکایت تھی، وہاں کے عوام بھی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور سارے انصاف پسند ہندوستانی قایدین اور خاص طور پر مجلس احرار پنجاب کی حمایت اس تحریک کو حاصل ہوئی۔ حکومت نے سختی سے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔

سینکڑوں محبانِ وطن گولی کا نشانہ بنے، پھر بھی تحریک ختم نہ ہو سکی۔ راجہ محمد اکبر خان جو میرپور کے ایک مخلص قائد تھے۔ وہ سرینگر میں جلسوں کی شرکت کے لئے پاپیادہ میرپور سے آئے تھے۔ وہ بڑے اچھے مقرر تھے۔ ان کی سیاسی جدوجہد کی وجہ سے انہیں بار بار قید کی سزائیں بھگتنی پڑیں۔ لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ آخر کار ریاستی حکومت کو برطانوی ہند سے مدد طلب کرنی پڑی۔ اور کشمیر آرڈی نینس جاری کیا گیا تاکہ ریاست سے باہر کے لوگ تحریک میں حصہ نہ لے سکیں اس کے ساتھ شکایات کی تحقیقات کے لئے گلانسی کمیشن مقرر ہوا، جس نے کئی اصلاحات تجویز کیں۔ لیکن یہ عوام کے مصائب کا مداوا نہیں ثابت ہوئیں۔ مسلم کانفرنس کی جدوجہد کا مقصد ریاست میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنا تھا۔ جس کے لئے سول نافرمانی کی تحریک بھی شروع کی گئی۔ اسی جدوجہد کے نتیجے کے طور پر ریاست میں مجلس نمائندگاں یا پرجا سبھا کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۳۵ء کو گوپال سوامی آئینگر ریاست کے وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔ مجلس نمائندگاں قائم کر کے جو آئین نافذ ہو گیا تھا۔ وہ قائدین ریاست کی توقعات کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے مکمل ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک برابر جاری رہی۔ آزادی کی کشمکش میں میرپور کے باشندوں نے بھی کافی حصہ لیا اور تحریک کے لئے رہنما بھی فراہم کئے۔

۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کی از سرِ نو تنظیم ہوئی اور شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، پنڈت جیا لال کلم، پنڈت شیام لال صراف، اور سردار بدھ سنگھ کے دستخط سے قومی مطالبے کی دستاویز تیار ہوئی۔ مسلم کانفرنس کا ایک خاص اجلاس جو خواجہ غلام محمد صادق کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں مسلم کانفرنس، آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی قرارداد منظور

کی گئی۔ ۱۹۴۴ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے دو عوامی وزیروں کا تقرر منظور کیا۔ جن میں سے ایک مرزا محمد افضل بیگ اور دوسرے گنگارام تھے۔ اس ادھورے جمہوری نظام سے نیشنل کانفرنس کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے ۱۹۴۶ء "کشمیر چھوڑ دو" کی انقلابی تحریک شروع ہوئی۔ جس کا مقصد مہاراجہ کو مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنے کے لئے مجبور کرنا تھا۔ خواجہ غلام محمد صادق نے اس تحریک کی پیش رفت کے لئے جو جدوجہد کی تھی، اس کا ماحصل ان کی مرتبہ کتاب "کشمیر چھوڑ دو" میں ملتا ہے۔[۱]

اقتدار کے ہتھکنڈے اب بھی جاری تھے اور اقتدار ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ اسی زمانے کے وزیر اعظم پنڈت رام چند کاک کے اشاروں پر نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں پیپلز کانفرنس قائم کرنے کی بھی کوشش کی گئی اور حالات جو روبراہ ہونے لگے تھے، ان میں پھر گڑبڑ مچ گئی اور ظلم و ستم کا بازار پھر گرم ہو گیا۔ بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق نے کشمیر سے لاہور جا کر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ پنڈت نہرو نے حالات کو سنبھالنے کے مقصد سے کشمیر آنا چاہا۔ تو مہاراجہ کے حکم سے کوہالہ کے پل پر کشمیر کے گورنر مہاراج کشن نے انہیں گرفتار کر لیا۔ مہاراجہ کے اس ناعاقبت اندیشانہ فعل نے سارے ہندوستان کو ان کا مخالف بنا دیا۔ آخر مہاتما گاندھی کشمیر آئے اور مہاراجہ کو رعایا کا اعتماد حاصل کرنے کی صلاح دی۔ مہاتما جی کے مشورے کی پیش رفت کے لئے وزیر اعظم رام چندر کاک کو برطرف کر کے پہلے جنرل جنک سنگھ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ان کے بعد مہر چند مہاجن اس عہدہ پر فائز ہوئے۔ اسی دوران میں ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے ہندوستان کی حکومت سے دست برداری اختیار کر لی اور انڈین نیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کی منظوری سے ملک کا بٹوارہ بھارت اور پاکستان میں ہو گیا اور آزاد ہندوستان

---

[۱] شیخ محمد عبداللہ تحریک کشمیر چھوڑ دو کے اصل ہیرو تھے۔ لیکن اس بیان میں ان کا ذکر تک نہیں۔

اور آزاد پاکستان کی دو خود مختار حکومتیں قایم ہوگئیں۔ لیکن بھارت کو چھوڑتے ہوئے انگریز شاطر نے ایسی چال چلی تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور لاکھوں بے گناہ عوام کا خون بہایا گیا۔ تاہم شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقائے کار کی مساعی کی وجہ سے کشمیر اس کشت و خون سے محفوظ رہا۔

جموں و کشمیر، بھارت اور پاکستان دونوں کی سرحدوں سے ملی ہوئی ریاست ہونے کے اعتبار سے، کسی ایک میں اس کے شمول کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مہاراجہ ہری سنگھ نے دونوں سے حالات جوں کے توں برقرار رکھنے کا معاہدہ کرلیا۔ کچھ اندرونی سمجھوتے ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ کو جو بغاوت کے الزام میں قید کر دیئے گئے تھے، رہا کیا گیا اور بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق بھی جو لاہور جلا وطنی کاٹ رہے تھے وطن واپس آگئے۔ اسی زمانے میں پونچھ میں ہنگامہ برپا ہوا اور جموں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ آخر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قبائیلیوں نے کشمیر پر چڑھائی کر دی اور مہاراجہ ہری سنگھ نے مصلحت اس میں دیکھی کہ ریاست کا ہندوستان سے الحاق کرلیں۔ لیکن مسلم اکثریت والی ریاست ہونے کی وجہ سے پاکستان کے حکمران پاکستان سے اس کا الحاق چاہتے تھے، اس طرح یہ ریاست ایک استخوان نزاعی بن گئی۔ اس زمانے میں کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی حُبِ وطن کے ترانے بڑے میٹھے سُروں میں گائے۔ افسانہ نگاروں میں سے پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در نے قبائیلیوں کے خلاف اہلِ وطن کے جذبات کو اُبھارنے کے لئے افسانے لکھے اور دِشوناتھ ماہ اور دوسرے شعرا نے جذبات کو اُبھارنے والی نظمیں لکھیں۔ اس طرح کافی ادبی سرگرمیاں رہیں۔ اس دارو گیر کی فضائیں، نیشنل کانفرنس کے قائدین کو حکومت سنبھالنے کی دعوت دی گئی اور شیخ محمد عبداللہ نے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے ملک کا انتظام

اپنے ہاتھ میں لیا چنانچہ اپریل ۱۹۴۸ء میں پہلی دفعہ ریاست میں نمائندہ قومی حکومت قائم ہوئی۔ اور مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر چھوڑ کر بمبئی چلے گئے اور ڈوگرہ خاندان کی مطلق العنان حکومت کا ایک سو پانچ سال کے بعد خاتمہ ہو گیا۔ تاہم ہری سنگھ کے فرزند یوراج کرن سنگھ نئے دستور کے تحت صدرِ ریاست بنائے گئے۔

شیخ محمد عبداللہ نے عہد کے تقاضوں کی پیش رفت میں، ریاست کو تعلیمی، صنعتی اور نظم ونسق کے اعتبار سے، دوسری ریاستوں کی سطح تک بلند کرنے کی جدوجہد کی۔ اسکولوں میں اضافہ ہوا اور کئی کالج قائم کئے گئے۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں جموں وکشمیر یونیورسٹی قائم ہوئی، جس کا ایک اہم شعبہ اُردو بھی ہے۔ خواتین کی تعلیم اور طب اور انجنیری کی تعلیم کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ کالج قائم کئے گئے[1]

شیخ محمد عبداللہ بہ حیثیت وزیرِ اعظم کے چھ سال تک برسرِ عہدہ رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں بخشی غلام محمد نے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے نظم و نسق کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور ۱۹۶۲ء تک وزیرِ اعظم رہے۔ آخر کامراج پلان کے ماتحت وہ وزارتِ عظمیٰ سے دست بردار ہوئے، کچھ دن خواجہ شمس الدین نے یہ عہدہ سنبھالا، اس کے بعد خواجہ غلام محمد صادق، جو بخشی غلام محمد کے زمانے میں وزیرِ تعلیم تھے۔ ریاست کے وزیرِ اعظم کا عہدہ وزیرِ اعلیٰ میں تبدیل ہو گیا۔ صدرِ ریاست کی بجائے گورنر مقرر ہوا۔ ریاست میں انڈین نیشنل کانفرنس کی ریاستی شاخ قائم کی گئی جس کے صدر سید میر قاسم منتخب ہوئے۔ اور سکریٹری بیگم زینب چھنی گنیش۔ ۱۹۶۸ء میں میر قاسم پردیش کانگریس کی صدارت سے دست کش ہو گئے[2]

کشتواڑ ! کشتواڑ، آب وہوا مناظر اور اپنی تاریخ کے لحاظ سے ریاست

---

[1] اب اس یونیورسٹی کے بطن سے کشمیر اور جموں کی دو الگ الگ یونیورسٹیاں وجود میں آگئی ہیں اور دونوں میں اردو کے شعبے موجود ہیں۔

[2] سرورتی صاحب کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ اور وہ آگے نہ لکھ سکے۔

کا ایک اہم علاقہ رہا۔ اس کا قدیم نام سامرتھ گڈھ تھا، اور مشہور ہے کہ پانڈوؤں نے
اسے آباد کیا تھا۔ کشیر کی طرح کشتواڑ کی سرزمین کے بارے میں بھی یہ روایت ہے کہ
یہ ایک جھیل تھی، کثرت باراں سے ٹھاٹھری کے قریب پہاڑوں کے شق ہوجانے
کی وجہ سے پانی بہہ گیا اور زمین برآمد ہوئی اور صرف چوگان میدان کے قریب باقی
رہ گیا، جسے قدیم زمانے میں گوہر دن سر کہتے تھے لیکن اب یہ گودن سر مشہور ہے۔
سب سے پہلے یہاں شرہ پال نامی ایک رشی نے آکر قیام کیا تھا۔ اور لوگ
اس کے کشف وکرامات کا شہرت سُن کر، وہاں آکر بستے گئے اور اس علاقہ کا
نام مہاکال گڈھ پڑگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد، اس عابد کے معتقدین نے جادہ صواب
سے انحراف کرنا شروع کیا، جس پر عابد نے بد دعا کی اور سارا علاقہ ویران ہوگیا۔
جب اس پر عرصہ گذر گیا تو وہاں ایک برہمن ہنکپت نامی نے آکر قیام
کیا اور اس کی اولاد اس علاقہ میں پھیل گئی۔ پھر کشمیر سے گنائی اور راٹھور قبیلے
یہاں آکر آباد ہوگئے اور ملک پر تسلط قائم کرلیا۔ وکرمادتیہ کی اولاد سے ایک
راجہ کانپال نامی نے بھی یہاں حکومت کی۔ اس کے تین بیٹوں، گندرب سین،
مندرسین اور دیپ سین میں سے بڑا گندرب سین باپ کی جگہ گدی پر بیٹھا۔
مندرسین نے ایک گاؤں بسایا جو اب منا نام سے موسوم ہے۔ دیپ سین نے مڑویہ
کو اپنا مستقر بنایا جو کشمیر کا ایک علاقہ ہے۔ اس کی اولاد میں مہاسین، نراین سین،
رام سین، کام سین، مدن سین، برہمہ سین، اودت دیو، اور تپتا دیو نے حکومت کی۔
راجا پنیا کا بیٹا کنکا دیو تھا جس نے چرچی ولولہ کے علاقہ کو بھی فتح کرکے اپنی
سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس کے بیٹے گورد دیو، سنگدیو، رکھدیو، اندر دیو
اوتار دیو، بھاگ اور رائے دیو یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔ رائے دیو کو
لوگوں نے ملک سے بے دخل کردیا تھا۔ اور اس نے کوہ کونگن ہرن میں پناہ لی تھی۔

اور اسے آباد کیا تھا۔ لیکن یہ علاقہ معشیت کے لئے سہولیت بخش نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اپنی آبائی سلطنت پر حملہ کر کے اس پر پھر قبضہ کر لیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی نسل سے گورو دیو اور رودگر دیو نے حکومت کی۔ مؤخر الذکر راجا نے اطراف کے بعض علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اس کا بیٹا بھولار دیو اور پوتا لچھمن دیو داس کے جانشین ہوئے۔ لچھمن دیو نے پرگنہ دیسہ کو مغلوب کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔

روایت ہے کہ راجا سنگرام سنگھ کے زمانے میں ایک دیو نمودار ہوا تھا۔ جو لوگوں کو ہلاک کرتا تھا۔ اس کو سنگرام نام عابد برہمن نے جلا کر، لوگوں کو اس عذاب سے نجات دلائی۔ سنگرام کی اولاد میں جگت سنگھ، بھاگ سنگھ، سنگار سنگھ، میگھن سنگھ، دیپ سنگھ، فیروز سنگھ، نراین سنگھ، سلہن سنگھ، رائے سنگھ، اور گھمبیر سنگھ باری باری سے حکمرانی کرتے رہے۔ آخری راجا کے عہد میں اکبر نے ہاشم خاں، صفدر خاں، اور احمد بیگ کی سرکردگی میں ایک فوج کشتواڑ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی تھی۔ لیکن راستے کی دقتوں کی وجہ سے فوج کو کامیابی نہیں ہوئی۔

کشمیر کے چک حکمران علی شاہ کے عہد میں، کشتواڑ کے راجا بہادر سنگھ نے چکوں کی طاعت قبول کر لی تھی اور اپنی بہن شنکر دیبی کو یعقوب شاہ چک کے عقد میں دے دیا تھا۔ اسی تعلق سے جب مغلوں کا قبضہ کشمیر پر ہو گیا۔ اور چک حکمرانوں کو کشمیر سے بھاگنا پڑا۔ تو انہوں نے کشتواڑ کے راجا کے یہاں پناہ لی تھی۔ ۱۰۲۵ھ میں یعقوب شاہ چک جب کشتواڑ میں پناہ گزین تھا، مرض صعب میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ اس کی یادگار میں اس کی بیوہ شنگر دیئی یا شنکر دیوی نے ایک نہر تعمیر کروائی تھی، جو شنکر موجی کے نام سے موسوم ہے۔

بہادر سنگھ کے بعد پرتاپ سنگھ نے بھوپ سنگھ کا نام اختیار کر کے کشتواڑ

کی حکومت سنبھالی۔ اس کے زمانے میں شہنشاہ جہانگیر نے میرزا حیدر کوکر میر اور میرزا محمد زمان مغل کی قیادت میں فوج روانہ کی۔ لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے، فوج کو کامیابی نہیں ہوئی اور میرزا محمد خان قتل ہوگیا۔ اس کی بیوی نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے شوہر کے قتل کا انتقام کشتواڑ کے راجا سے نہ لے گی۔ چین سے نہیں بیٹھے گی۔ چنانچہ اس کی درخواست پر جہانگیر نے پھر فوج روانہ کی جس نے کشتواڑ پر قبضہ کرلیا۔ محمد خان کی بیوہ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد کشمیر کو چلی گئی اور بھوپ سنگھ نے میدان خالی پاکر، پھر کشتواڑ پر قبضہ کرلیا۔ بھوپ سنگھ کے بعد اس کا بیٹا اوگرسین گدی پر بیٹھا۔ جب جہانگیر کو کشتواڑ کی بغاوت کی خبر ملی تو اس نے ۱۰۲۸ھ میں دلاور خاں صوبہ دار کشمیر کو حکم دیا کہ کشتواڑ کو پوری طرح قبضہ میں لائے۔ چنانچہ دلاور خاں سنگپورہ کی راہ سے، جمال خاں مربوہ کی راہ سے اور جلال خاں اور علی ملک براره بال کے راستے سے کشتواڑ کی طرف بڑھے اور اسے پورے طور پر اپنے قبضے میں کرلیا۔ راجا اوگرسین اسیر ہوا اور جہانگیر کو اس فتح کی خوش خبری بھیجی گئی۔ اس پر جہانگیر نے فرمان دیا کہ کشتواڑ کے راجا سے خراج مقرر کرکے اسے اپنے علاقے کو واپس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ راجا نے اپنے دوسرے بیٹے بھگوان سنگھ کو دہلی روانہ کردیا، اور خود کشتواڑ میں حکومت کرتا رہا۔

اوگرسین کے انتقال کے بعد اس کا بڑا لڑکا جگت سنگھ، گدی نشین ہوا۔ اس اثناء میں جہانگیر کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور شاہ جہاں تخت دہلی پر متمکن تھا۔ شاہ جہاں کی دکن میں فوج کشی کے موقع پر بھگوان سنگھ نے بڑی دلیری اور وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس کی وفاداری سے خوش ہوکر، شاہ جہاں نے اسے خلعت اور منصب عطا کی۔ اسی زمانے میں جگت سنگھ جب بھدرواہ پر فوج کشی کے لئے گیا ہوا تھا۔ متصلہ علاقے کے راجا بھوپت نے کشتواڑ پر قبضہ کرلیا۔

جگت سنگھ نے پریشان ہوکر، شاہجہاں کو اس کی اطلاع بھیجی۔ شاہجہاں نے جیون سین اور پران سین کے ہمرکاب بارہ ہزار فوج روانہ کی اور کشتواڑ کو پھر جگت سنگھ کے قبضۂ تصرّف میں دے دیا۔

جگت سنگھ کا بیٹا، مہا سنگھ جو ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور باپ کے بعد کشتواڑ کی گدی پر قابض ہوا۔ علم و ادب کا ذوق رکھتا تھا اور فارسی، سنسکرت اور عروض میں اسے مہارت تھی۔ فارسی اور ہندی میں وہ شعر بھی کہتا تھا۔ اس کے افکار اپنے مقام پر نقل کئے گئے ہیں۔ اس کے زمانے میں ملّا محمودؔ کے فرزند ملّا بہادر اور ملّا حسین دہلی سے کشتواڑ آئے اور وسط کشتواڑ میں ایک مسجد تعمیر کی۔

جگت سنگھ کے بیٹے جے سنگھ کے عہد میں حفیظ اللہ خاں کشمیر کا ناظم تھا۔ اس زمانے میں بغداد کے ایک زاہد مرتاض فرید الدینؒ، کشتواڑ آکر مقیم ہوئے۔ ان کے فرزندوں میں شاہ اسرار الدین بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ حافظ عنایت اللہ ان کے خلیفہ تھے۔ جنہیں عالمگیر نے ماگام میں جاگیر عطا کی تھی۔ ۱۰۹۹ء میں جے سنگھ کے بیٹے کرت سنگھ نے اسلام قبول کیا اور سعادت یار خان کے نام سے موسوم ہوا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہی کشتواڑ کا راجہ مقرر ہوا۔ کرت سنگھ کی بہن بھوپ دیی شہزادہ محمد کے نکاح میں تھی۔ کرت سنگھ کا بیٹا ملوک سنگھ سعادت مند خاں کے لقب سے گدی نشین ہوا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ گمان سنگھ، مہر سنگھ، سجان سنگھ اور دلیل سنگھ، گمان سنگھ کا انتقال کم عمری میں ہو گیا تھا اس لئے باپ کے بعد دوسرا بیٹا مہر سنگھ گدی پر بیٹھا۔ لیکن دوسرے بھائیوں کے دل میں بھی جہاں بانی کی ہوس ہوئی۔ اس زمانے میں رنجیت سنگھ سے امداد طلب کی۔ لیکن اسی زمانے بسوہلی کے راجہ نے کشتواڑ پر فوج کشی کردی۔ مہر سنگھ مقابلے کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر دلیل سنگھ نے چھمب کے راجا رائے سنگھ سے مدد چاہی۔ بسوہلی کے

راجا نے جب رائے سنگھ کی فوج کشی کی خبر سنی تو کشتواڑ کو تباہ و تاراج کر کے اپنے علاقے کو لوٹ گیا۔ رائے سنگھ نے اس اُجڑی نگری پر قبضہ کر لیا۔ اسی عرصہ میں مہر سنگھ کشمیر سے کمک لے کر کشتواڑ آیا اور رائے سنگھ کو شکست دے کر اپنے ملک پر دوبارہ قابض ہو گیا۔

سُجان سنگھ کی دعوت پر رنجیت سنگھ نے کشتواڑ پر فوج کشی کی، اور سجان سنگھ اس فوج کی مدد سے کشتواڑ کا راجا بن بیٹھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا عنایت اللہ سنگھ راجا ہوا۔ یہ راجا بھی علم و ادب سے دلچسپی رکھتا تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ عنایت اللہ سنگھ اپنے چچا گلاب سنگھ کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ گلاب سنگھ چالیس دن حکومت کرنے نہیں پایا تھا کہ کشتواڑ کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور اسے اور اس کے وزیر نور الدین کو قتل کر کے عنایت اللہ سنگھ کے بیٹے تیغ سنگھ کو گدی پر بٹھایا۔ لکھپت رائے، جو بعد میں گلاب سنگھ بانئ ریاست جموں و کشمیر کا وزیر رہا۔ تیغ سنگھ کا بھی وزیر رہا تھا۔

گلاب سنگھ کے عروج کے بعد کشتواڑ کا علاقہ وزیر لکھپت کی امداد سے گلاب سنگھ کی قلمرو میں شامل ہو گیا اور ریاست کا ایک تعلقہ بن کر رہ گیا۔

سنسکرت زبان اور ادب

کشمیر میں سنسکرت زبان بہت قدیم زمانے میں علمی اور ادبی اغراض کے لئے رائج رہی۔ خیال یہ ہے کہ سنسکرت یہاں ابتدائی آریہ قبیلوں کے ساتھ آئی، جو اپنے مشترک ہند ایرانی یا آریائی گروہ سے الگ ہو کر، کشمیر اور ہندوستان کی طرف پرباس کر کے آئے تھے۔ یہ لوگ ابتدائی پراکرتوں میں سے ایک پراکرت اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو غالباً ویدی سے بہت مشابہہ تھی۔ چنانچہ اس بارے میں قدیم ترین شہادت جو پنڈت بلہن کی تحریروں سے ملتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے زمانے میں کشمیر میں پڑھے لکھے لوگ اور عوام جن میں عورتیں بھی شامل ہیں سنسکرت اور پراکرت بول سکتے تھے۔

اشوک کے زمانے میں جب بدھ مت وادی میں داخل ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی علمی روایت کے اتباع میں، بدھ مت کے علماء نے جو کتابیں تصنیف کیں، وہ پالی کی بجائے سنسکرت ہی میں لکھی گئیں۔ حالانکہ ہندوستان میں بدھ مذہب کی

مُسلمہ زبان پالی تھی۔ اس زبان میں اگر کچھ کتابیں لکھی گئی ہوں گی تو اب نہ ان کے آثار ملتے ہیں اور نہ ان کا تذکرہ۔ لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آسکتی کہ بُدھ مت کے اصلی صحائف کے ساتھ پالی یہاں نہ پہنچی ہوگی۔ ایک ضعیف روایت پالی کی تصنیف "مِلند پنہو" کے مصنف ناگ سین کے بارے میں یہ ملتی ہے کہ وہ کشمیر کی سرحد کے قریب ناگ سینی کا رہنے والا تھا۔ اس میں صرف نام کی مناسبت، نسبت کا سبب معلوم ہوتی ہے۔ پرتھوی ناتھ کول بامزئی نے بھی ایک پالی تصنیف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اشوک[1] کے عہد میں بُدھ مذہب کی چوتھی مجلس کشمیر میں منعقد ہوئی تھی، جس کے مباحث کے نتیجے کے طور پر مہایان شاخ کی بنیاد پڑی۔ اس کا سارا ادب پالی کے علاوہ سنسکرت میں لکھا گیا۔ کشمیر کی اسی اہمیت کی وجہ سے بُدھ مت کے علماء اور طالب علم نہ صرف ہندوستان بلکہ وسطِ ایشیا اور چین سے بھی یہاں آتے تھے۔ چینی سیاح اور عالم ہیونتسانگ اور کئی دوسرے علماء کشمیر آئے اور یہاں رہے تھے۔ اس زمانے میں سنسکرت لکھنے کے لئے کھروشٹھی اور براہمی رسم خط استعمال ہوتا تھا، لیکن کشمیری علماء نے ایک نیا رسم خط نشو ونما دیا تھا، جو شارداکہلاتا ہے اور کشمیر کی قدیم سنسکرت کتابیں اسی رسم خط میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

بُدھ مذہب کی تعلیمات کے علاوہ، قواعد، عروض، شعریات یا فن شعر پر بہت سی کتابیں جو یہاں سنسکرت میں لکھی گئی تھیں سنسکرت ادب کا قیمتی سرمایہ مانی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری اور ناٹک کے بھی قابلِ قدر کارنامے یہاں لکھے گئے۔ افسانے اور تاریخیں بھی لکھی گئیں اور شیو مذہب کے بارے میں بھی بہت سا ادب سنسکرت ہی میں پیدا ہوا۔

سنسکرت کے مشہور قواعد نویس پتنجلی کے بارے میں، جس نے پانینی کی "اشٹادھیائی" کی شرح "مہابھاشیہ" لکھی تھی، یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کشمیری خاندان

---

[1] یہ مجلس اشوک کے نہیں، کنشک کے زمانے میں ہوئی تھی۔

سے تھا یا کشمیر آیا تھا۔ لیکن مستند علماء کے نزدیک یہ خیال درست نہیں ہے۔ تاہم "مہابھاشیہ" کے مطالعے کو وادی میں بہت فروغ حاصل رہا تھا۔ کشمیر کے خاص کارناموں میں "اُبت بھاشا" ایک اہم کارنامہ ہے جو "شکلا یجروید" کی شرح ہے۔ سنسکرت افعال پر کشمیر سوامنؔ کی تصنیف "دھاتو پد" جو راجا جیاپیڈ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اہمیت رکھتی ہے۔ پانینی کی تصنیف کی ایک شرح "کسی کو یرتی" جے دت اور وامن کا مشترکہ کام ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں۔ بھٹ بگدھر اور ہبو بھٹ علی الترتیب "بالبودھنی" اور "بھگ ورتی" کے مصنف ہوئے ہیں۔

قواعد کے ساتھ ساتھ عروض پر بھی قابلِ اعتنا کام کشمیری علماء نے انجام دیا تھا۔ اس سلسلے میں پنگلاچاریہ کی تصنیف "پنگلا" کیدار بھٹ کی تصنیف "ورتیر تنکار" کشمیندر کی تصنیف "سوترت تلک" اور مممٹ کی "سوذویہ پرچار" قابلِ ذکر ہیں۔ لغات نگاری میں بھی کچھ اچھے کارنامے انجام پائے۔ جن میں منکھا کی "انیکرتھ کوش" اہمیت رکھتی ہے۔ اس پر کشمیر سوامن نے "ترما لنگو شش نام" کے عنوان سے شرح بھی لکھی تھی۔

شعریات یا النکار شاستر بھی کشمیری علماء کا ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اس موضوع پر بھی کافی تصانیف ملتی ہیں۔ النکار، رس، ریتی، دکروتی اور اوچیتا اور چند اور شعری اور ادبی شعبوں کو انہوں نے بہت ترقی دی۔ جہاں تک رس کے دبستان کا تعلق ہے، لولٹ اور سنکوک، دونوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے اس نظریے کی توسیع کی۔ یہ دونوں راجا جیاپیڈ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابھنو گپت کے مطابق "رس" مظہرِ حق ہے۔ جیاپیڈ کے دربار کا پنڈت بھٹ اُدبھٹ نے اپنی تصانیف "کاویلنکار ورتی" اور "النکار سنگرہا" میں اس موضوع پر بڑی قابلانہ بحث کی ہے اور اکتالیس النکاروں کی تفہیم کی ہے۔ رُدرٹ نے "کاویلنکار" میں شعریات

کے سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جیا پیڈ کا وزیر وامن، ریتی دبستان کے وکیلوں میں سے تھا، اور اپنی تصنیف "کاویلنکار سوترا" میں اس نے ریتی کو شاعری کی روح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مقابلے میں راجنک کنتل نے "وکروتی" کی اہمیت کو زیادہ واضح کیا ہے۔ کشیمندر، جس کی قواعد اور عروض کی تصنیف کا ذکر گذر چکا ہے۔ شاعری کے اوچتیہ نظریئے پر "اوچتیہ وچار" اور "کوی کنٹھا برن" لکھی تھیں۔

شاعری میں "دھونی" یا "علم الاصوات" پر کشمیری علماء کی تصانیف عہد آفرین مانی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں آنند وردھن کی تصنیف "دھونیالوک" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آنند وردھن کا زمانہ راجہ اونتی ورمن کے عہد میں مطابقت رکھتا ہے، جو کشمیر کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں عہدِ زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنند وردھن کا شاہکار اس عہد کی ہمہ جہتی، فنی اور علمی ترقی کا ایک جزو ہے۔ اس عہد میں شاعری، عمارت کاری، موسیقی اور مورت گری سب ہی اپنی نئی بلندیوں کو پہنچ چکی تھیں اور یہی آنند وردھن کے لئے الہامی فضا ثابت ہوئی۔

آنند وردھن متنوّع دلچسپیوں کا عالم تھا، جمالیات کے علاوہ فلسفہ شاعری، ناٹک اور مذہبیات اس کے موضوع تھے۔ لیکن مورخ کلہن اس کا تذکرہ شاعر کی حیثیت سے کرتا ہے۔ آنند وردھن کے بعد آنے والوں میں مُکل بھٹ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے اپنی تصنیف "ابھی دھورتی ماتریکا" میں اور مسائل کے علاوہ الفاظ کے ابتدائی اور ثانوی مفہوم پر بھی بحث کرلی ہے اور اس طرح "معنیات" کے جدید ترین علم کی شروعات اس کی کتاب میں ملتی ہیں۔

ابھنوگپت، شاعر، نقاد، فلسفی اور مذہبی علوم میں کمال رکھتا تھا۔ جمالیات پر اس کی تصانیف "ابھینوابھارتی" اور "لوچنا" کشمیر کا سب سے بہتر کارنامہ تسلیم

کی جاتی ہیں۔ اس کے شاگرد ممٹاچاری نے بھی شعریات اور جمالیات میں قابل اعتنا اضافہ کیا تھا۔ اس نے بنارس میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ اس کی تصنیف "کاویہ پرکاش" شعر کی خوبیوں اور عیوب اور بلاغت کے فن سے بحث کرتی ہے۔ اس کی دوسری تصانیف "النکار انوسرنی" "شردیہ لیلا" اور "سنکیت نیکا" بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

شعر اور ڈرامہ میں بھی کشمیری ادیبوں کے کارنامے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پروفیسر پشپ نے بلہن کے حوالے سے تنجین اور رانا دتیہ کے عہد (۱۰۲-۱۱۹) کے مہاکوی چندرا کا ذکر کیا ہے جو ڈراما لکھتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے ایک شاعر اور ڈرامہ نگار چندک کا ذکر بعض کارناموں میں ملتا ہے، لیکن اس کی تصانیف کا پتہ نہیں چلتا۔ ماتری گپت جس کو وکرما دتیہ نے کچھ عرصے کے لئے کشمیر کی حکومت پر نامزد کیا تھا، بعض مورخین کے خیال میں مشہور شاعر کالی داس ہی تھا۔ لیکن سند سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔ راجا جیا پیڈ کا وزیر دامودر گپت اچھا شاعر تھا۔ لیکن اس کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کی تصنیف "کُٹنی مت کادیہ" جو باقی رہ گئی ہے، عشق و محبت کے بارے میں اچھا رسالہ ہے، جس میں کئی دلچسپ کہانیاں بھی شامل ہیں۔ ان کہانیوں سے اس زمانے کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

جیا پیڈ کے متوسل شعرا میں بھٹ اُدبھٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی نظم "کمار سمبھو" اب دستیاب نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے کچھ اشعار، خود اس کی اپنی تصنیف "النکار سنگرہ" میں مل جاتے ہیں۔ سنکوک نامی ایک شاعر آٹھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے، جس نے ایک "تاریخی رزمیہ نظم" بھوونا بھیودیم" لکھی تھی جس میں مما اور اُتپلا کی جنگ کی تفصیل بیان کی ہے۔

کارکوٹ خاندان کے کئی راجہ شاعر تھے۔ کلہن نے ان کا تذکرہ کیا ہے اور مکتا پیڈ اور جیا پیڈ کے کچھ اشعار "سوبھاشتادلی" میں منقول ملتے ہیں۔ راجہ اونتی ورمن کا عہد

فنکاری اور تعمیر کاری کے اعتبار سے شاندار عہد تھا۔ اس کے دربار میں بہت سے اچھے شاعر موجود تھے۔ آنند وردھن کے علاوہ جس کا ذکر پہلے بھی آیا ہے۔ شِوسوامن، رتناکر، مَنکھا کن کا شمار اپنے عہد کے اچھے شعرا میں ہوتا تھا۔ شِوسوامن نے بُدھ مت کی ایک روایت کو منظوم کیا تھا۔ رتناکر کی مشہور نظم "ہروجئے" ایک مذہبی موضوع پر ہے۔ لیکن اس کی شاعرانہ صلاحیتوں نے اُس کو ادبی مقام بھی عطا کیا ہے۔ بھلت ایک اور شاعر ہے، جس کی نظم "بھلت شتک" اخلاقی ہے۔ وہ راجہ شنکرورمن کا معاصر تھا۔ ابھینند دسویں صدی کے نصف اول کا شاعر ہے جس نے بانؔ کی نثری داستان کو "کادمبری کتھاسار" کے عنوان سے منظوم کیا تھا۔

کشمیندر، جس کا ذکر اس سے پہلے بھی آیا ہے، شعریات اور عروض کے علاوہ، کئی موضوعات سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ریاضیات، نجوم، طب، جراحی، سیاست، عشقیات اور نہ جانے کن کن علوم میں اسے مہارت تھی۔ بُدھ اور شیو فلسفہ کا بھی وہ عالم مانا جاتا ہے۔ مورخین کشمیر نے اس کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ لیکن ایک میدان یعنی سماجی ہجو نگاری میں وہ بے مثل تھا۔ اپنی نظم "سمیئے ماترِکا" میں ایک بیسوا کی داوی گیری میں گشت کی تفصیل لکھی ہے جس میں اس نے مغنیوں، بھکاریوں، دکاندار لڑکیوں، مذہبی تقدس کا ادعا کرنے والے لوگوں چوروں اور سماج کے دوسرے طبقے کے لوگوں کی بڑی دلچسپ ہجویہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اسی طرح "کلاولاس" نظم بھی مختلف پیشے کے لوگوں کے بڑے دلچسپ خاکے پیش کرتی ہے۔

اس کی ایک اور نظم "دیشوپدیش" میں بھی سماج کے بگڑے ہوئے طبقوں، جیسے دھوکہ بازوں، بخیلوں، بیسواؤں، کٹنیوں، عیاشوں، طالب علموں، ہنرمندوں، جوان لڑکیوں سے شادی کرنے والے بوڑھوں وغیرہ کی مضحک تصویریں۔

کھینچی ہیں۔ اس کی "برہت کتھا منجری" گناڈھیہ کی گم گشتہ "برہت کتھا" کا منظوم خلاصہ ہے۔

بلہن ایک اور شاعر تھا، جو کلش (۱۰۸۹ - ۱۰۶۳ء) کے عہد میں دکن گیا اور چالوکیہ حکمران پرماوی وکرما دیتیہ تربھون ملا کے دربار میں بڑی عزت کی جگہ پائی۔ اس نے اپنے مربی کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی جو "وکرمنکا دیوا چرتیا" کے نام سے موسوم ہے اور سنسکرت کی پہلی تاریخی نظم سمجھی جاتی ہے۔ اسی شاعر نے ایک اور نظم "کرنا سندری" بھی لکھی ہے، جو بظاہر ایک عشقیہ افسانہ ہے۔ لیکن وجہی کی قطب مشتری کی طرح جس نے اپنے مربی محمد قلی قطب شاہ کے عشق کی داستان افسانے کے پیرایہ میں لکھی تھی، بلہن نے بھی اس نظم میں چالوکیہ راجہ کے بیاہ کی داستان بیان کی ہے۔

تاریخی موضوع پر کشمیر کے ایک اور شاعر سمبو نے بھی نظم لکھی تھی، جو راجہ ہرشں کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ منکھ راجہ جیا سمہا کے دربار کا شاعر تھا، وہ اپنی نظم "سری کنٹھا چرت" کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ نظم شیو کے تریپورہ پر فتح پانے سے متعلق ہے، لیکن اس میں موسموں اور مناظر کا بیان بھی بڑی خوبی رکھتا ہے۔ یہ نظم جب مکمل ہوگئی تو شاعر نے اسے شعرا، علماء اور عہدہ داروں کی ایک مجلس میں پڑھ کر سنایا تھا۔ اس محفل میں "راج ترنگنی" کا مصنف کلہن بھی شامل تھا۔ منکھ نے سنسکرت کی ایک لغت بھی لکھی تھی۔

کشمیر میں سنسکرت ادب اور علوم کی تاریخ ایک علمی پہلو سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تاریخی تصانیف ہیں۔ قدیم ہندوستان میں ادب، فلسفہ، مذہب اور دوسرے علوم کے بارے میں قابلِ قدر کارنامے سرانجام پائے، لیکن تاریخی تصانیف کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی زندگی کے متنوع پہلوؤں کے بارے میں، قدیم زمانے کی تصنیف "کتاب الہند" ایک غیر ہندوستانی، مسلمان

البیرونی کی لکھی ہوئی ہے۔ سنسکرت میں قدیم دور کی کوئی تاریخ نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے کشمیر کے تاریخی کارناموں کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ماقبل تاریخ زمانے کے بارے میں "نیلامت پُران" ایک اہم دستاویز ہے، جسے اُس کی قدامت کی وجہ سے مذہبی صحیفہ کی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ کشمیر کے ستی سر سے برآمد ہونے کی روایت کا یہی اہم ماخذ ہے۔ کشمیر کے ناگ راجاؤں کے دیوتا نیل نے اس میں اپنی پرستش کے ضوابط اور پشاچوں سے لوگوں کے محفوظ رہنے کی راہیں بھی بتاتی ہیں۔ اس پُران میں مقدس تیرتھوں اور کچھ حکمرانوں کے نام بھی آئے ہیں۔ پنڈت کلہن نے اپنی یادگار تاریخی تصنیف "راج ترنگنی" میں اس سے بڑی مدد لی تھی اور اس کے علاوہ گیارہ اور تصانیف کا بھی اس نے ذکر کیا ہے، جو اب ناپید ہیں۔ مقدس تیرتھوں کے بارے میں کئی اور بھی تصانیف ملتی ہیں۔ لیکن ان میں جے درتھ کی "ہرچرت چنتامنی" کو اہمیت حاصل ہے، جو بارھویں صدی عیسوی کے اواخر یا تیرھویں صدی کے آغاز میں گذرا ہے۔ راجہ جیا پیڈ کے درباری شاعر کی تصنیف "کُٹنمتا کاویہ" سے معاصر عہد، یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں کشمیر کی سماجی اور معاشی زندگی پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ کشمیندر کی بعض تصانیف کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ جس میں اُس نے اپنے عہد کی سماجی زندگی کے وسیع مرقعے پیش کئے ہیں۔ اس کی ایک اور کتاب "نرما ولی" اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے، جس میں کشیر یو کی سماجی زندگی کی عمدہ تصویریں ملتی ہیں۔ ایک اور نظم "نرم مالا" میں بھی اس نے اپنے عہد کی بد انتظامیوں کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ "لوک پرکاش" سے نظم و نسق کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کچھ دستاویزوں کے نمونے ملتے ہیں۔ کشمیندر کی "سمے ماترِکا" اور بلہن کی "وکرم انک دیو چرت" کی طرف اشارے کئے جاچکے

لیکن سنسکرت میں لکھے ہوئے تاریخی کارناموں میں، کشمیر کا کوئی کارنامہ پنڈت کلہن کی یادگار تصنیف، "راج ترنگنی" کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی تعریف میں ساری علمی دنیا رطب اللسان ہے۔ کلہن نے اس یادگار کارنامے کی تکمیل ۱۱۴۸-۴۹ء میں کی۔ بعض مصنفین نے قدیم عہد کے کارناموں میں اسے واحد تاریخی کتاب بتایا ہے۔ کلہن نے کچھ اصول تاریخ نگاری کے بھی اس میں بیان کئے ہیں۔ جو اس کے پیش نظر تھے۔ یہ طویل نظم آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ جن میں ابتدا سے لے کر بارہویں صدی کے وسط تک جتنے حکمران خاندان کشمیر میں گذرے ہیں، ان کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ بعد کے تاریخ نگاروں نے اس سے استفادہ کیا اور زین العابدین بادشاہ کے حکم سے مُلا احمد نے اس کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا (۱۵۹۴ء) جو "بحر الاسمار"[۱] کے نام سے موسوم تھا۔ سلطان زین العابدین نے سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے لئے ایک دار الترجمہ[۲] بھی قائم کیا تھا، جس میں کچھ کتابیں سنسکرت میں بھی تصنیف ہوئی تھیں۔

سنسکرت ادب کو ہندو راجاؤں کے بعد، شاہ میری حکمرانوں کے عہد میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر زین العابدین بادشاہ کی سرپرستی قابل ذکر ہے۔ جس کے عہد میں جون راج نے کلہن کی تاریخ کو پندرھویں صدی کے وسط تک پہنچایا تھا۔ جون راج کی وفات ۱۴۵۹ء میں ہوئی۔ بادشاہ کے زمانے کا مشہور سنسکرت شاعر اور

۱۔ "بحر الاسمار" کے معنی ہیں "قصوں کا سمندر"۔ راج ترنگنی کا یہ فارسی ترجمہ غالباً ادھورا رہا تھا۔ اسی لئے شہنشاہ اکبر نے ۱۵۹۴ء میں ملا احمد بدایونی کو اس ترجمہ پر دوبارہ مامور کیا تھا۔ ملاحظہ ہو (تاریخ کشمیر۔ بامزئی صفحہ ۲۰۳)۔

۲۔ بقول حسن ملا احمد کشمیری نے مہابھارت کا کشمیری ترجمہ بھی کیا تھا۔

عالم تھا۔ اس نے کلہن کی تاریخ میں ہندو راجاؤں، جے سمہا سے لے کر آخری حکمران کوٹا رانی کے عہد تک کے واقعات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جون راج کے بعد، اس کے شاگرد شری ور نے اس سلسلہ کو ۱۴۸۶ء تک پہنچایا۔

پراجیہ بھٹ نے "راجو لیتپکا" میں ۱۵۱۳-۱۴ء تک کے واقعات قلمبند کئے تھے، اور اس کا تکملے اس کے شاگرد شک نے کیا اور اکبر کے عہد میں کشمیر کے الحاق (۱۵۸۶ء) پر اسے ختم کیا ہے۔ کلہن کے بعد کے اضافے اور کارنامے شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے "راج ترنگنی" کو نہیں پہنچ سکے، تاہم تاریخی حقایق کی پیش کشی اور معاصرانہ زندگی کے بیان کے لحاظ سے یہ بھی قابلِ قدر کارنامے ہیں۔

کشمیر میں اسلامی عہد کے آغاز کے دو سو برس بعد تک بھی سنسکرت کو اہمیت حاصل رہی، اور شاعری اور دوسری علمی تصانیف کے لئے پنڈت علماء کے لئے یہی زبان استعمال ہوتی رہی لیکن جیسا جیسا فارسی کی اہمیت بڑھتی گئی سنسکرت میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ ختم ہوتا گیا۔

ہندو راج کے آخری زمانے میں نرہری پنڈت، ایک بڑا عالم وید گزرا ہے، جس نے "نرگھنٹو راج" نامی کتاب لکھی تھی۔ بعض علماء کی تحقیق کے مطابق وہ دکھنی برہمن تھا اور ایشور سوری کا بیٹا تھا جو ایک کشمیری برہمن بتایا جاتا ہے۔ نرہری سہم دیو اور شاہمیر کے عہد میں تھا۔ اس کی تصنیف میٹریا میڈیکا کی ایک لغت ہے۔ ایک اور وید جس نے "رسائن پرکرن" لکھی تھی۔ ۱۳۰۷ء میں زندہ تھا۔

سکھوں کے عہد میں کشمیر میں نمایاں اہمیت رکھنے والے سنسکرت علماء کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پچھلے سینکڑوں برس سے سنسکرت علم و ادب کا ذوق جو کشمیر میں پرورش پاتا رہا تھا وہ یک لخت ختم ہو گیا ہوگا۔ تاہم سکھ

حکمرانوں کو تھوڑا سا عرصہ جو کشمیر میں تسلط کا ملا، وہ رنجیت سنگھ کے زمانے سے قطع نظر، زیادہ تر مسلم آبادی کو بے دست و پا کرنے اور اپنے قابو میں رکھنے میں صرف ہوا۔ اس کے علاوہ سکھوں میں علم و ادب کی روایات ابھی نشو و نما نہیں پا سکی تھیں کہ ان کا دور ختم ہو گیا اور سنسکرت علماء ہمت افزائی اور سرپرستی کے نہ ہونے کی وجہ سے کسمپرسی میں پڑے رہے۔ اسی لئے اس دور میں کسی سنسکرت عالم کے منظرِ عام پر آنے کی شہادت نہیں ملتی۔

سکھوں کے بعد ڈوگرا عہد میں، مہاراجہ گلاب سنگھ کا زمانہ میں بھی علم و ادب کس مپرسی میں پڑے رہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ اس خاندان کے ایسے حکمران ہیں، جن کی توجہ زیادہ تر سنسکرت علوم کو فروغ دینے میں صرف ہوئی۔ انہوں نے جموں میں رگھوناتھ مندر میں ایک وسیع سنسکرت کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں نادر سنسکرت کتب اور مخطوطات جمع کی گئی تھیں۔ مندر سے ملحق پاٹھشالہ میں سنسکرت کی تعلیم اور تربیت کے لئے بڑی فراخ دلی سے اہتمام کیا تھا۔ اس سرپرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی سنسکرت عالم ان کے عہد میں منظرِ عام پر آئے۔

عربی زبان اور ادب

اسلام اور اسلامی عقائد کے ساتھ اسلامی تہذیب کی زبان عربی بھی کشمیر میں روشناس ہوئی۔ اسلامی اثرات کشمیر میں راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کے زمانے سے داخل ہونے لگے تھے۔ اس زمانے میں وسط ایشیا کے وہ ترک جو اسلام لا چکے تھے، کشمیر کی سرحدوں تک پہنچنے لگے تھے اور راجہ ہرش نے کئی ترک سرداروں کو اپنی فوج میں ملازم بھی رکھا تھا۔ مورخین نے ہرش کے بارے میں یہ بھی لکھا کہ وہ اسلامی عقائد سے متاثر تھا۔ چنانچہ بت پرستی سے اس کی بیزاری اور مندروں کو مسمار کرنے اور بتوں کو توڑنے پھوڑنے کی وجہ سے کلہن نے اسے "ترسکہ" (ترک مسلمان) کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اس وقت تک کشمیر کی سرحدوں پر آباد دَرد قبیلے بھی اسلام قبول کر چکے تھے اور بارہویں صدی عیسوی میں مسلمان ترکوں نے اپنے سردار دُسمیہ کی سرکردگی میں کشمیر تک اپنا اثر و رسوخ پھیلا لیا تھا۔ سَسلا اور بھکشاچر کی خانہ جنگیوں میں، متذکرہ بالا سَسلا کے صدر مقام لوہر پر حملہ کرنے کے لئے ان ترک مسلمانوں سے مدد لی تھی۔ مارکو پولو کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۷۰ء کے قریب

کشمیر میں مسلمان موجود تھے۔ اسی زمانے میں مسلمان علما کشمیر پہنچ کر اسلامی عقائد کی تبلیغ بھی کرنے لگے تھے اور کشمیر کے لوگ۔ جو اس وقت تک بُدھ مت اور برہمنیت اور ان کے ماننے والوں کے آپس کے جھگڑوں سے اُکتا گئے تھے، اسلام کے پیغام پر کان دھرنے لگے تھے۔

کشمیر میں اسلامی عقاید کی اشاعت کے سلسلے میں، حضرت عبدالرحمٰن[1] بُلبُل شاہ کی یہاں آمد ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ شاہ نعمت اللہ فارسی کے معتقدین میں سے تھے۔ جو سہروردی طریقے کے مشہور صوفی گزرے ہیں۔ بُلبُل شاہ نے اسلامی ممالک کے وسیع سفر کئے تھے، اور راجہ سہدیو کے عہدِ حکومت (۱۳۰۱ء تا ۱۳۲۰ء) میں پہلی دفعہ آپ کشمیر آئے تھے لیکن دوسری دفعہ رینچن شاہ کے عہد (۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۳ء) میں جب آپ اور آپ کے کچھ رفقاء کشمیر آئے تو عام اہلِ کشمیر کے علاوہ خود رینچن شاہ بھی بُدھ مت اور برہمنیت سے برگشتہ ہو رہا تھا۔ کشمیر کی حکومت حاصل کرنے اور ہندو رانی، کوٹہ سے شادی کرنے کے بعد، اس نے برہمن مذہب اختیار کرنا چاہا تھا، لیکن برہمنوں کے انکار کی وجہ سے، وہ دُگدا میں پڑا ہوا تھا۔ جب بُلبُل شاہ سے اس کی مُلاقات ہوئی، تو اس کے ذہنی اور روحانی سکون کا وسیلہ مل گیا اور وہ آپ کے ہاتھ پر اسلام لے آیا۔ حضرت بُلبُل شاہ نے رینچن اور اس کے بعض اہلِ خاندان کو اسلامی عقائد سے واقف کرانے کے سلسلے میں انہیں عربی زبان پڑھائی ہوگی۔ بُلبُل شاہ کے ہمراہ آنے والے علماء میں مُلا احمد علامہ اہمیت رکھتے ہیں، جنہوں نے سُلطان شہاب الدین کے عہد میں "فتاوای شہابیہ" مرتب کی تھی۔ مُلا احمد علامہ، سلطان زین العابدین بڈشاہ کے ملک الشعرا اور مصنف مُلا احمد کشمیری کے نانا ہوتے ہیں۔

کشمیر میں عربی زبان کی اشاعت کا ابتدائی دور حضرت بُلبُل شاہ اور مُلا احمد علامہ سے لے کر سلطان سکندر کے عہد میں سلطنت کے استحکام کے زمانے تک ہے۔ خود سکندر

---

[1] شرف الدین ان کے نام کا جزو لاینفک ہے۔

کے زمانے میں اور اس کے بعد سلطان زین العابدین کے عہد میں وسط ایشیا اور ایران سے علما کشمیر آنے لگے تو عربی زبان اور علوم کی اشاعت کے عروج کے مواقع پیدا ہو گئے۔ لیکن جلد ہی فارسی زبان کے فشار نے عربی زبان اور علوم وفنون کو پورے قد وقامت تک پہنچنے سے باز رکھا۔ کشمیری حکومت کے آغاز ہی سے فارسی درباری زبان کے طور پر اختیار کر لی گئی تھی اور جلد ہی فارسی علوم وفنون اور ادب کو بھی عروج حاصل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ کشمیر "ایران صغیر" سے یاد کیا جانے لگا۔ لیکن مذہب اور علم وفن کی زبان ہونے کے تعلق سے خاص طور پر علما میں عربی کا رواج آخر تک رہا۔ اور آج بھی عربی کے عالم کشمیر میں موجود ہیں، جو اس زبان میں تصنیف وتالیف کر سکتے ہیں، اور کچھ تقریر پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

رینچن شاہ کے انتقال کے بعد ملک میں جو بدامنی پھیل گئی تھی، اس کو دور کر کے امن وامان قائم کرنے کے بعد شمس الدین شاہ میرزا (۱۳۳۹ء تا ۱۳۴۲ء) نے اپنا اقتدار مستحکم کر لیا، تو اہل ملک کی ذہنی اور مذہبی تربیت کی طرف اس کی توجہ ہوئی، اور اس نے اطراف کے اسلامی ملکوں سے علما کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ ان علما کے آنے سے عربی تعلیم وتدریس کا انتظام کیا جا سکا۔ ان علما میں جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گرد بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ کشمیر میں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

سلطان شہاب الدین کا عہد (۱۳۵۵ء تا ۱۳۷۶ء) نظم ونسق کے استحکام کے ساتھ عربی علوم وفنون کی ترویج کی ابتدا کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اسی پادشاہ کے زمانے حضرت سید علی ہمدانی پہلی دفعہ کشمیر تشریف لائے اور سلطان کے آباد کئے ہوئے محلہ شہاب الدین پورہ میں مقیم رہے، جو اب شہام پورہ کہلاتا ہے۔ آپ نے اپنے قیام کے زمانے میں سلطان اور اس کے اہل وعیال کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا اور جب یہاں سے واپس تشریف لے گئے تو کچھ علما کو مسلمانوں کی تعلیم کی غرض سے یہاں چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مصنف "کشیر" نے اس زمانے کے ایک طبیب شہاب الدین عبد الکریم کا ذکر کیا ہے جو فنِ طب میں ایک مستند تصنیف "شفاء الامراض" کے مصنف تھے۔ صوفی کا خیال ہے کہ یہ سلطان قطب الدین کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

سلطان قطب الدین (۱۳۷۳ء - ۱۳۸۹ء) کے عہد میں عربی علوم و فنون کی اشاعت کی جو بنیاد شہاب الدین کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ اس میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس کے عہد میں حضرت میر علی ہمدانی دوسری دفعہ کشمیر تشریف لائے اور قطب الدین کے بسائے ہوئے محلہ قطب الدین پورہ میں چھ ماہ قیام کیا۔ اس دفعہ آپ کے ہمراہ کوئی سات سو علماء تھے۔ حضرت سید ہمدانی کے مشورے سے سلطان نے قطب الدین پورہ میں علوم قرآن اور دوسرے اسلامی علوم کی تعلیم دینے کے لئے ایک دار العلوم بھی قائم کیا تھا۔ جس میں درس دینے کے لئے جید علماء مقرر کئے گئے تھے۔ اس دار العلوم کے اساتذہ میں بعد کو ملا جوہر ناتھ، ملا عبد الستار مفتی، ملا محسن فانی جیسے عالم شامل رہے اور ابو المشایخ شیخ سلیمان، جو اپنے عہد کے مستند عالم اور تجوید کے امام مانے گئے ہیں۔ اسی دار العلوم کے فارغ التحصیل تھے۔ بعد کے زمانے میں شیخ رحمۃ اللہ تارہ بلی، خواجہ قاسم ترمذی، ملا محمد کاؤسہ جیسے عالم اور غنی کاشمیری، ملا محمد نافع جیسے بلند پایہ شاعر ادیب اور مورخ یہیں سے فیض یاب ہو کر نکلے۔

حضرت سید علی ہمدانی، چھ ماہ کے قیام کے بعد، جب یہاں سے تشریف لے گئے تو اپنے رفقا میں سے کئی جید علماء کو سلطان، اس کے اہل خاندان اور عام مسلمانوں کو دینی علوم کی تعلیم اور تدریس کے لئے یہیں چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ ان علماء میں مولانا جلال الدین محدث، پیر حاجی محمد قاری، سید جلال الدین عطائی، سید فخر الدین، سید کمال الدین، مولانا احمد، سید کمال الدین ثانی، سید فیروز، سید محمد کاظم، سید رکن الدین، سید محمد قریشی، سید احمد قریشی، سید بہاؤ الدین، سید کبیر الدین

عربی اور اسلامی علوم میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔ سید محمد قادری، یہاں پہلے سے مقیم تھے۔ اور حضرت سید ہمدانی کے ورودِ مسعود پر فارسی میں ایک قطعہ کہا تھا۔

قطب الدین پورہ کے دارالعلوم کے صدر پیر حاجی قاری تھے اور سید محمد کاظم، حضرت سید ہمدانی کے خاص کتب خانے کے مہتمم رہے تھے۔ کئی علمار کو حضرت سید ہمدانی نے دیہات اور قریوں میں قرآن اور اسلامی علوم کی تعلیم دینے کی غرض سے روانہ کیا تھا۔ سید محمد قریشی جو بجبہاڑہ گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک وسیع مسجد تعمیر کروائی تھی۔ سید جلال الدین عطائی، موضع شیر پرگنہ کھاورہ نزد کرُ ہامہ میں مقیم ہوئے۔ جہاں وہ اطراف و اکناف کے مسلمانوں میں علوم دین کی اشاعت کا مرکز بن گئے تھے۔ سید کمال الدین کو سلطان قطب الدین اور اس کے خاندان کو اسلامی علوم کی تعلیم دینے کے لئے خود حضرت سید علی ہمدانی نے مقرر فرمایا تھا۔ مورخ پیر غلام حسن کھویہامی لکھتے ہیں کہ سید کمال الدین کی تعلیم سے بے شمار لوگ علوم دین میں کامل ہو گئے تھے اور بعضوں نے قرب الٰہی کے مراتب بھی حاصل کر لئے تھے۔

حضرت سید علی ہمدانیؒ اپنے روحانی اوصاف کے ساتھ ساتھ، بلند پایہ عالم اور مصنف بھی تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ آپ کے والد سید شہاب الدین، ہمدان کے حاکم تھے، لیکن آپ نے دنیوی جاہ و مراتب سے کنارہ کشی کی اور مختلف مقامات کا سفر کر کے، عوام اور خواص میں تعلیماتِ اسلامی کی اشاعت اور روحانی فیض رسانی کے فریضہ کو اختیار کیا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم، ماموں سید علاؤ الدولہ سمنانی کے پاس ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں علاؤ الدولہ نے، سید ہمدانی کی تربیت اپنے ایک جید مرید، شیخ ابوالبرکات سید تقی الدین علی دستی کے تفویض کی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ مشہور صوفی شیخ محمود مزدقانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ریاضت شاقہ کے بعد روحانی کمالات حاصل کئے۔ شیخ نجم الدین سے حدیث کی تکمیل کی اور ان

گوناں گوں تحصیلات کے بعد آپ نے ممالک اسلامی اور دوسرے ملکوں کا سفر اختیار کیا اور علم دین کی اشاعت میں مصروف ہوتے۔

حضرتِ ہمدانی کے تصنیف کئے ہوئے عربی اور فارسی رسالوں کی تعداد ایک سو ستر سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے اب ساٹھ ستر کے قریب دستیاب ہوتے ہیں۔ ریسرچ لائبریری سری نگر کے ایک مخطوطے میں آپ کے کوئی پچیس تیس عربی اور فارسی رسائے محفوظ ہیں۔ ان رسالوں میں عربی کے رسائل یہ ہیں:۔

رسالۂ معرفت زہد، رسالہ اورادیہ، چہل حدیث، رسالہ اربعینیہ، رسالہ خواطریہ، رسالہ احادیث، رسالہ ذکریہ، رسالہ قدوسیہ۔

آپ نے بہت سے روحانی بزرگوں سے استفادہ کے موقع پر، اُن سے اوراد جمع کئے تھے۔ ان کا ایک مجموعۂ اورادِ فتحیہ" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ آپ کی ہدایت کے بموجب کشمیر کی مساجد میں نمازِ صبح کے بعد ان اوراد کو لوگ بآوازِ بلند ہر روز اب بھی پڑھتے ہیں۔

سلطان سکندر کے عہد میں جو علماء کشمیر آئے ان میں حاجی ابراہیم اونچا پایہ رکھتے ہیں۔ دسویں صدی کے نصف اول کے علماء میں مولانا حافظ عبدالبصیر مُلّا بابا نابینا عالم، فقہ، حدیث، تفسیر کے علاوہ ریاضی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ ان کے شاگردوں میں بابا داؤد خاکیؒ، شیخ یعقوب صرفیؒ اور شمس الدین پال بلند پایہ عالم ہوئے۔ بابا کا انتقال ۹۴۶ھ میں ہوا۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ کا عہد، کشمیر کی تاریخ میں ہر جہتی عروج کا دور تھا۔ علوم وفنون کی ترقی اور اشاعت میں بھی یہ دور ممتاز ہے۔ سلطان نے بھی ایک دارالعلوم قائم کیا تھا، جس کے اخراجات کے لئے ناگام کے کئی گاؤں عطا کئے تھے۔ اس دارالعلوم میں تدریس کے فرائض، مولانا کبیر، مُلّا حافظ بغدادی

مولانا قاضی میر علی اور دوسرے مستند علماء کے ذمہ تھے۔ مولانا کبیر دارالعلوم کے صدر بھی تھے۔ وہ ہرات کے علماء سے علوم دینی اور دنیوی کی تکمیل کے بعد کشمیر آئے تھے۔ اور سلطان زین العابدین نے انہیں نہ صرف اپنے دارالعلوم میں تدریس کے لئے مقرر کیا تھا۔ انہیں شیخ الاسلام کا عہدہ دے کر سلطان نے اپنی تعلیم کے لئے بھی منتخب کیا تھا۔

سلطان زین العابدین کے دربار میں اس عہد کے سربرآوردہ علماء جمع تھے۔ ان میں کشمیر کے علاوہ وہ عالم بھی شامل تھے جنہیں سلطان نے ایران اور ترکستان سے بلوایا تھا۔ ان علماء کی فہرست طویل ہے۔ ان میں جو قابل ذکر ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

ملا احمد کشمیری، ملا پارسا، مولانا قادری، ملا ضیائی، ملا ندیمی، ملا علی شیرازی، مولانا حسین غزنوی، ملا احمد رومی، ملا محمد رومی، ملا نورالدین۔ مولانا سید محمد منطقی، ملا حافظ بغدادی، جن کا ذکر اوپر بھی آیا ہے۔ مولانا جمال الدین، قاضی میر علی، سید ناصرالدین بیہقی، قاضی جمال الدین کے تفویض کشمیر کی قضاۃ تھی اور ملا حافظ بغدادی، سلطان کے دربار کے رکن تھے اور ان کا بیشتر وقت علوم اسلامی کی تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ کشمیر کے مشہور صوفی بزرگ حضرت نورالدین ریشی جو سلسلہ ریشیہ کے بانی ہونے کے علاوہ حضرت بہاء الدین گنج بخش اور سید ناصرالدین بیہقی، سربرآوردہ صوفیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سلطان کے دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ میں ملا پارسا بھی قابل ذکر ہیں، جو اسم با مسمیٰ تھے۔ اس زمانے کے ایک اور بزرگ حضرت سید حسین، اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت ممتاز تھے۔ سید حسن بیہقی ایک اور عالم تھے۔ جن کا سلطان بڑا احترام کرتا تھا۔ ان کے فرزند سید محمد امین، کو جو بڑے روحانی کمالات کے بزرگ ہوئے سلطان نے اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔ آپ کے چچا سید حسین بیہقی، سلطان کے وزیر تھے۔

سلطان زین العابدین کے بعد اس کے جانشینوں میں سے بہت کم ایسے ہوئے، جنہیں علوم و فنون سے ایسا گہرا لگاؤ اور ان کی ترقی کا ایسا خیال تھا۔ اس کا ایک سبب وہ کشمکش بھی تھی، جو سلطان کے جانشینوں میں شروع ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود، جو شجر بار آور ہو چکا تھا، اس کی اچھی طرح آبیاری نہ ہونے کے باوجود وقفہ وقفہ سے علماء منظر عام پر آتے رہے۔ چنانچہ سلطان حسن شاہ کے عہد میں شیخ شہاب الدین سندی جیسے عالم اور عربی کے شاعر موجود تھے۔ سلطان حسن شاہ کو خود موسیقی سے دلچسپی تھی۔ شیخ شہاب الدین کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں، جو کشمیر کی توصیف میں ہیں:

کانّ کشمیر و سکانہا ❊ جنّاتُ عدنٍ للمومنین

قد کتب اللّٰہ علی بابہا ❊ مَن دخلہا کان آمنین

حسن شاہ کے بعد کے عہد میں حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے معتقدین میں کئی علماً سر برآوردہ نظر آتے ہیں لیکن ان کے کارنامے زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ کشمیری سلاطین کے آخری عہد میں، قاضی محمد صالح فقہ میں سند کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ایک اور بزرگ بابا داؤد مشکوانی تھے جنہیں "مشکوٰۃ" پر اتنا عبور حاصل تھا کہ زبانی سُنا سکتے تھے۔ اخوند ملا کمال، کشمیر کے ناقابل فراموش علماً میں سے ہیں۔ مُلا کمال اور مُلا جمال دو بھائی تھے، اور دونوں علوم معقول و منقول کے عالم، چک سلاطین کے عہد کے مذہبی منافشات میں، ان کا دل کشمیر سے اس سرزمین کے اور کئی قابل فرزندوں کی طرح اُکتا گیا اور وہ سیالکوٹ چلے گئے۔ مُلا کمال کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ سیالکوٹ میں وہ علوم کی اشاعت کا مرکز بن گئے تھے۔ ان کے درسوں سے تین ایسے بلند پایہ عالم اُٹھے جنہوں نے ہندوستان، بلکہ ساری دنیائے اسلام میں ایک مقام حاصل کیا۔ یہ مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی، مولانا شیخ احمد سرہندی

جو مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے، اور تیسرے سعداللہ خان علامی، جو دہلی میں وزارت کے منصب پر فائز رہے۔ ملا کمال کے علم و فضل کی شہرت ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک تک پہنچ گئی تھی۔ ان کا انتقال ۱۰۱۶ھ میں ہوا۔

بابا داؤد خاکی، حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے فیض یافتگان میں سے تھے، عربی کے درس انہوں نے اپنے عہد کے جید فضلا، جیسے ملا بشیر اور ملا رضی سے لئے تھے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نازک شاہ کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔ لیکن حضرت مخدومؒ سے بیعت کے بعد ملازمت ترک کر دی اور خدا کی یاد میں بسر کرنے لگے۔ فارسی کے وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ خاکی کا انتقال ۱۵۸۵ء میں ہوا۔ ان کے معاصرین میں شیخ یعقوب صرفی، بھی علوم دین اور ادب کی خدمت میں سربرآوردہ مانے جاتے ہیں۔ فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصانیف ہیں۔ قرآن کی تفسیر عربی میں لکھنی شروع کی تھی جو نامکمل رہ گئی۔ فیضی کی بے نقط تفسیر قرآن "سواطع الالہام"، پر صرفی نے بھی بے نقط تقریظ لکھی تھی۔ جو قلم برداشتہ لکھی گئی تھی۔ شیخ احمد سرہندی نے صرفی سے حدیث کے درس لئے تھے۔ صرفی کی تصانیف کئی ہیں اور اکثر فارسی میں ہیں۔ چکوں کے عہد میں تشیعوں کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے، اکبر سے درخواست کرنے صرفی اور خاکی دہلی گئے تھے۔

خاکی کے خلفا میں بابا نصیب الدین غازی کو بڑا مرتبہ حاصل ہوا۔ علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ میں وہ اتنے مشہور ہوئے تھے کہ "ابوالفقرا" کے نام سے موسوم ہو گئے تھے۔ علم دین کی اشاعت کی غرض سے انہوں نے تبت کا بھی سفر کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۰۴۷ھ میں ہوئی۔ حاجی احمد قاری، مخدوم عباس ملتانی کے فرزند، حافظ قرآن، عالم اور صوفی تھے۔ بابا داؤد خاکی جب قاری سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے اتنے متاثر ہوئے کہ

اپنے ساتھ کشمیر لائے۔ حاجی احمدؔ نے یہاں بڑی خدمت یہ انجام دی کہ قرآن خوانی میں جو غلط تلفظ رائج ہو گئے تھے۔ ان کی اصلاح کی۔

مولوی جعفر، مخدوم شیخ حمزہ کے مریدوں میں اپنے اُبچی رجحانات کی بدولت ایک مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب "رموز الطالبین" کے نام سے لکھی تھی۔ جس کی ایک فصل میں قرآن اور احادیث کے شواہد پر موسیقی کو مباح قرار دیا تھا۔ مخدومؒ نے کتاب پڑھ کر اُن کی محنت کی تعریف کی، لیکن اس کی نویں فصل کو نکال دینے کا مشورہ دیا۔ کیوں کہ اس سے لوگوں کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا۔

ملا جوہر ناتھ کا ذکر، سلطان قطب الدین کے دار العلوم کے فارغ التحصیلوں میں کیا گیا تھا۔ ملاؔ بلند پایہ محدث اور علوم عقلیہ کے جامع تھے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد حج کو گئے اور مکہ اور مدینہ کے علماء سے بھی استفادہ کیا تھا۔ کشمیر لوٹنے کے بعد، عربی کے درس و تدریس میں مشغول رہے۔ شرح مُلا جامی پر ان کا حاشیہ مشہور ہے۔ مُلاؔ کا انتقال ۹۲۶ھ میں ہوا۔ مولانا شمس الدین گنائی حضرت شیخ یعقوب صرفی کے چچازاد بھائی تھے۔ عربی کے اچھے عالم تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک شیعہ ان کے پاس امتحان لینے کیلئے آنکھوں پر پٹی باندھ کر آیا اور علاج کی خواہش کی۔ اس پر انہوں نے کہا تھا —— "الممتحن ملعونٌ" اور یہ شعر پڑھتا تھا:

اذا ما مقلتی رمدت فکحلی غبار بعد عقلی للتراب

شمس الدین کی وفات کا سنہ ۱۰۵۰ھ ہے۔

اخوند ملا نازک ناشوانی حاجی محمد فتح اللہ سیالکوٹی سے ارادت رکھتے تھے، اور عالم اور عربی کے شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعر معرفت میں کہے ہوئے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اَنتَ مطلوبٌ و معبودٌ لنا　　اَنتَ منظورٌ و مقصودٌ لنا

آن وعدتم بالنقاء فی الآخرۃ　　وھو فی الکونین مشھود لنا

لا نری فی الکون الا وجھک　　انت مشھود وموجود لنا

مذھب الوھاد منسوب لھم　　مشرب العشاق محمود لنا

(تاریخ اولیاء کشمیر صفحہ ۲۴۷۔ حسن)

میاں محمد امین ڈار۔ مرفہ الحال تاجر تھے، لاہور کے ایک سفر میں ان کی ملاقات میاں عبدالوہاب لاہوری سے ہوئی۔ ان کی صحبتوں میں محمد امین کو بھی علم و عرفان سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور اپنی دولت مساکین میں تقسیم کر کے یادِ خدا میں مشغول رہنے لگے۔ دو کتابیں "کتاب قصرات" اور "رسالہ ضروریہ" بھی تصنیف کی تھے۔ اورنگ زیب ان کا قدردان تھا۔ ڈار کا انتقال سنہ ۱۰۹۹ھ میں ہوا۔

ملا محسن کشمیری، ملا محمد کشمیری اور ملا محمد اشرف کشمیری بھی گیارہویں صدی کے اواخر کے علماء اور مصنفین میں قابل ذکر ہیں۔ ملا محسن "نجات المومنین" کے مصنف تھے۔ ملا محمد کی تصنیف نہیں ملتی، لیکن ان کی ایک عربی کتاب کی کچھ عبارتوں کو حالیہ زمانے کے ایک عربی مصنف، مولوی حامد حسین نے اپنی تصنیف "استقصاء الافحام و استیفاء الانتقام فی نقض منتہی الکلام" میں سند کے طور پر نقل کی ہیں۔ ملا اشرف عالم اور عربی کے شاعر تھے۔ اپنے ایک معاصر عالم ملا عبدالشکور ٹیلو کشمیری کی وفات پر انہوں نے عربی میں مرثیہ لکھا تھا۔

ملا محسن فانی، شاہ جہاں کے کشمیری عالموں اور فارسی کے شاعروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ شیخ یعقوب صرفی کے وہ شاگرد رشید اور غنی کے معاصرین عالموں اور شاعروں میں امتیاز رکھتے تھے۔ کشمیر میں علوم کی تحصیل کے بعد صرفی نے تلاش میں کئی اسلامی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ بلخ میں کچھ عرصہ قیام کیا، جہاں والی بلخ نذر محمد خان نے ان کے علم و فضل کی قدر کی۔ ہندوستان لوٹے تو شاہ جہاں نے ان کی

سرپرستی کی اور الہ آباد کی صدارت کا عہدہ انہیں عطا کیا۔ وہاں فانی شاہ محب اللہ الہ آبادی کے ارادتمندوں میں داخل ہوئے۔ دارا شکوہ بھی ان کے قدردانوں میں سے تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ کشمیر لوٹ آئے اور آخری زمانے تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔

ملا حسن گنائی، اپنے علم وفضل کی وجہ سے ایسی فضیلت رکھتے تھے کہ اکبر نے جہانگیر کی شہزادگی کے زمانے میں انہیں اس کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ اورنگ زیب نے جب شاہ جہاں کے خلاف کارروائی کرنی چاہی تھی تو جن علماء سے فتویٰ طلب کیا تھا۔ ان میں ملا حسن بھی تھے۔ لیکن انہوں نے عالمگیر کے ارادہ کی مخالفت میں احکام دیئے تھے۔ ملا حسن گوجو بھی علماء میں مقام رکھتے تھے۔ اور انہوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا تھا۔ ملا عبدالرزاق بانڈے کے علم وفضل سے متاثر ہو کر شاہ جہاں نے مدرسۂ کابل میں انہیں مدرس مقرر کیا تھا۔ شرح تجرید پر ان کا لکھا ہوا حاشیہ مستند مانا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ خاوند محمودؒ اپنے زمانے میں علم وفضل اور زہد و تقویٰ کی بدولت مرجع امام تھے۔ ان کے شاگرد محمد یوسف چیک، علم مباحثہ میں وہ بے مثل مانے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ملا محمد رضا حکیم دانا کے عرف سے مشہور تھے اور علوم عقلی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ جہانگیر کے دربار سے ان کا تعلق رہا اور احترام کی جگہ پاتی تھی۔ ملا فیروز بھی کشمیر کے علماء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے فرزند ملا عبدالوہاب عالم اور مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں علم معما پر ایک رسالہ "تعریف فی التصوف"، "شرح مواقف" اور "شرح منطق" قابل ذکر ہیں۔ ملا حیدر پشلو شیخ اکبر ہاذی سے فیض یافتگاں میں، علم تجوید میں مہارت کی بدولت شہرت رکھتے تھے۔ اس علم میں ان کی تصنیف "خیر الحسنات" عرصہ تک نصابی کتاب کی

حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ، وہ "رسم خط قرآن" "دُرِ یتیم" "غرائب الرغائب (فقہ میں)" "تصوف پر ایک رسالے" اور "شرح چہل و چہار حدیث" کے بھی مصنف تھے۔ شیخ اکبر ہادی بھی علم قرأت میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ "عوارف المعارف" اور "قصائد فارضیہ" کی شرحوں پر ان کے حاشیے اہمیت رکھتے ہیں۔

فقہ کے علماء میں مولانا ابوالفتح کلو اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے استاد مولانا حیدر چرخی بھی علمائے وقت میں سے تھے۔ مولانا ابوالفتح کو آخری عمر میں کشمیر کے مفتی کا عہدہ عطا ہوا تھا۔ ان کی ساری زندگی خدمتِ علم میں بسر ہوئی۔ اپنے مدرسہ میں وہ طالبانِ علم کو درس دیا کرتے تھے۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ جن میں "سیف الستائین" مشہور ہوئی۔ ملا رحمۃ اللہ لیشاہ کو علم و فضل کے ساتھ کتابوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ان کے ذاتی کتب خانے میں عربی اور فارسی چار ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہری، صاحبِ باطن بزرگ عربی اور فارسی کے عالم اور پیر طریقت تھے۔ سماع سے ان کو عشق تھا۔ کشمیری میں بھی ان کی تصانیف ہیں۔ فارسی کے شاعر تھے اور ان کی ایک تصنیف "تنبیہ القلوب" اہم کارنامہ تسلیم کی جاتی ہے۔

شیخ محمد مسعود عالم اور واعظ تھے۔ اور "مشکوٰۃ المصابیح" ان کی بڑی مرغوب تصنیف تھی۔ جسے وہ وعظ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

ملا حبیب اللہ کشمیری فرخ سیر کے عہد کے علماء میں امتیاز رکھتے ہیں۔ علم دین کا درس دیتے تھے اور فرخ سیر کے حکم سے "فتاوی عالمگیری" کا ترجمہ شروع کیا تھا، جو بادشاہ کے انتقال کی وجہ سے نامکمل رہ گیا۔ ملا عبدالرشید بینو کشمیری کا "کلمہ طیبہ کی فضیلت" میں منظوم رسالہ تین سو ساٹھ ابیات پر مشتمل ہے۔ اسی زمانے کے دوسرے

علما میں خواجہ شاہ نیاز نقشبندی، خواجہ محمد ٹوپی گرو اور مولوی جلال الدین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ نیاز عربی میں کچھ رسالوں کے مصنف ہیں، جو طبع نہیں ہوئے۔ خواجہ محمد نحو میں سند رکھتے تھے، انہوں نے کئی عربی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی تھیں۔ کشمیر سے باہر سے علمائے نحو پڑھنے کے لئے ان کی خدمت میں، آتے تھے۔ جلال الدین نے فقہ کی مشہور عربی کتاب "درالمختار" اور "خزینۃ الروایات" کی بھی شرحیں لکھی تھیں۔

آغا سید مہدی اور میر محی الدین مہدی بھی کشمیری علمائیں سے تھے۔ اول الذکر نے ایک کتاب "تمرینۃ الغرویہ" اور موخرالذکر نے "میزان المقادیر" لکھی تھی۔ پیر غلام رسول، کشمیر سے امرتسر چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک رسالہ تحقیق المرام فی منع قراۃ خلعت الامام" لکھا اور ایک اور رسالہ قادیانی عقاید کی رد میں "الہام الصحیح فی اثبات المسیح"، بھی لکھا تھا۔ جس کے جواب میں پیرِ قادیان نے اپنا عربی رسالہ "اتمام الحجۃ" تصنیف کیا۔ پیر غلام رسول نے کچھ اور رسایل فتاوی میں بھی لکھے تھے۔

ملا محسن فانی کے تلامذہ میں ملا محمد امین گانی، عالم اور شاعر تھے، اور عربی کی کئی متداول کتابوں کی شرحیں لکھی تھیں۔ علم فرائض پر بھی انہوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ ملا عبدالرحیم ففو، تحصیل علم کے بعد، درس و تدریس کا مرکز بنے رہے۔ کشمیر سے باہر سیاحت بھی کی۔ والی بخارا نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر، انہیں اپنے درباری علمائیں متوسل رکھا تھا۔ جب ہندوستان گئے تو عالمگیر نے بھی ان کی قدر کی۔ ملا محسن کھشو نے، ملا محمد امین گانی سے تحصیل کی تھی اور منقولات میں خود سند کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے اور درس دیا کرتے تھے۔ "عین العلم"، کی ایک شرح انہوں نے عربی اور المطول میں لکھی تھی اور ہدایہ پر حاشیے لکھے تھے۔ ان کے شاگردوں میں

مُلّا اشرف کھشو نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ علم قرأۃ سے انہیں بہت دلچسپی تھی، چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ ان کی وفات سنہ ۱۱۲۰ھ میں ہوئی۔ ان کے معاصرین میں مُلّا اشرف کھشو بھی مرتبہ کے عالم گذرے ہیں، جن کے ایک شاگرد مُلّا عبیداللہ علم مباحثہ میں ماہر تھے اور اچھے خطاط اور انشاء پرداز تھے۔ مولانا امان اللہ شہید علوم نقلی و عقلی میں عمدہ دستگاہ رکھتے تھے۔ کئی درسی کتابوں کے حاشیے اور شرحیں لکھی تھیں۔ محمد شاہ غازی نے ان کے علم و فضل کے مدنظر، انہیں شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔

مُلّا ابوالفتح کے فرزند ملا سلیمان، حساب، ہندسہ اور اصطرلاب کے عالم اور ماہر مانے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں عنایت اللہ خان ناظم کشمیر نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کی صدارت ملا حبیب اللہ کے تفویض کی تھی اور مُلّا سلیمان اس کے اساتذہ میں شامل تھے۔ مُلّا کاظم متو نے اسی زمانے کے قریب فقہ کے مسایل پر ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ علوم قرآنی کے بھی وہ عالم مانے جاتے تھے۔ مُلّا ابوالوفا شاہ عالم کی فوج میں وکیلِ شرعی کے ممتاز عہدہ پر فائز رہے۔ انہیں بھی مسایل فقہ سے گہرا شغف تھا اور مسایل فقہ کو انہوں نے چار جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ "انوار النبوۃ" کے عنوان سے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ ان کی وفات کا سنہ ۱۱۷۹ھ ہے۔

ہم سے قریب تر زمانے میں بھی، کشمیری علما میں عربی علم و فن اور خاص طور پر مذہبی علوم کے خدمت گذار پیدا ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ تیرہویں صدی کے آغاز میں مُلّا محمد سعید گندرو دوئم ہوئے ہیں۔ جو اسلامی علوم اور خاص طور پر قرآن سے متعلق علوم میں درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن کا ترجمہ فارسی میں "مفاتح البرکات" کے نام سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ "کبریت احمر" کی شرح لکھی تھی۔ انہیں صحیح بخاری اول سے آخر تک ازبر تھی۔

شیخ فدا محمد کشمیری مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے تھے، عربی علم و ادب سے انہیں ایسا گہرا لگاؤ تھا کہ شیخ نور محمد نوری کی مرتبہ تفسیر "مرام لعبید مکشف معنی قرآن مجید"، اور اس کے حاشیے پر مطبوعہ "تفسیر الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز"، کو جو دار الکتب العربیہ مصر سے اپنے ذاتی صرفہ سے دوبارہ چھپوایا تھا۔ ان کا مشغلہ کتابوں کی فروخت تھی۔

شاہ اسد اللہ؛ عبداللہ خان ناظم کشمیر کے عہد میں دینی علوم کے بڑے عالم گذرے ہیں۔ وہ شاہ منصور کے مدرسہ میں درس بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی وفات ۱۲۲۷ھ میں ہوئی۔ ملا قوام الدین ملا نور الہدیٰ کے تلامذہ میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ قرأت میں ماہر تھے اور محمد امین ویسی کی خانقاہ میں طالبانِ علم کو درس دیا کرتے تھے۔ احمد شاہ درانی نے انہیں شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کے شاگردوں میں مولوی نظام الدین احمد بڑے پایہ کے عالم اور متقی بزرگ ہوئے ہیں۔ کشمیر کی قضاۃ پر وہ مامور تھے۔ انہوں نے فارسی میں "تاریخ وقایع نظامیہ" لکھی تھی اور خواجہ اعظم دیدہ مری کی تاریخ کشمیر کا تکملہ بھی لکھا تھا۔ ان کی وفات کا سنہ ۱۲۴۰ھ ہے
میر نظام الدین بیہقی جن کا انتقال ۱۲۸۱ھ میں ہوا، متقی صوفی تھے، شعر و سخن سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ تصوف پر ایک رسالہ انہوں نے "عقل و عشق" کے نام سے تصنیف کیا تھا۔ میر سعید اندرابی نے مولانا غلام محی الدین جامعی سے دینی اور دنیوی علوم کی تکمیل کی تھی۔ کشمیر میں جب ان کی علمی تشنگی رفع نہ ہوئی، تو وہ شاہ جہاں آباد گئے اور وہاں مولوی محمد اسحاق دہلوی سے، اسلامی علوم اور فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ مولوی شریف سے باطنی تربیت حاصل کی، اور کشمیر لوٹ کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ان کے کارناموں میں قرآن مجید کی دو تفسیریں ہیں، جن میں سے ایک فارسی میں ہے اور ایک عربی میں۔ ان کی وفات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔

میر بزرگ شاہ عالم تھے اور حافظ قرآن بھی تھے۔ حرز یمانی ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رہا کرتی تھی۔ اسلامی تعلیم اور تبلیغ کے مقصد سے لداخ گئے تھے، وہیں لیہہ میں ان کا انتقال ۱۲۹۰ھ میں ہوگیا۔

مولانا عطاء اللہ کشمیری بھی بہت بڑے عالم گذرے ہیں۔ انہوں نے "افق المبین" کے حواشی لکھے تھے۔ ایک اور رسالہ مولانا فضل الحق خیر آبادی کے "حواشی سید زاہد" کی تنقید میں "التحقیق المحقق لما فی تحقیق المطلق" کے نام سے بھی لکھا تھا۔ پیر غلام مصطفےٰ قاسمی، جن کا انتقال ۱۳۵۲ھ میں ہوا۔ کتاب "رسالۃ الجلیلہ فی اثبات الوسیلہ" اور "مجمع النہرین" اور "احسن التقریر فی مسئلہ التکفیر" بھی ان کی تصنیف ہے۔

مولانا محمد الدین، کشمیر سے لاہور چلے گئے تھے۔ جہاں علوم عربیہ میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے امتحانات کامیاب کئے۔ اور اورینٹل کالج: لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے تھے۔ یہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ شعرائے متقدمین اور متاخرین کا تذکرہ "روضۃ الادبا" کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ "تفسیر فتح العظیم" "قلائد الذہب فی فوائد الادب" ان کی تصانیف ہیں۔ الف لیلہ عربی کے لغات کا حل بھی انہوں نے مرتب کیا تھا۔

مولانا محمد انور شاہ، کشمیری علماء میں بڑی عظیم ہستی ہوئے ہیں۔ وہ لولاب کے رہنے والے تھے۔ کشمیر میں تعلیم ختم کرنے کے بعد، دیوبند گئے۔ اور وہاں علوم اسلامی اور خاص طور پر حدیث میں سند حاصل کی۔ پھر وہیں شیخ الحدیث ہو گئے تھے۔ عربی تحریر اور تقریر پر ان کو ایسا قابو حاصل تھا کہ خود عرب بھی ان پر رشک کرتے تھے۔ انہوں نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ "عقیدۃ الاسلام" ان کی اہم تصنیف ہے مسئلہ قدر پر ایک طویل نظم بھی ان کی یادگار ہے۔ نعت میں بھی کئی

قصائد ہیں۔ انجمن نصرۃ الاسلام کے سالانہ جلسہ (۱۳۳۰ھ) میں ان کی عربی تقریر انجمن کی روداد میں شایع ہوئی ہے۔ مولوی غلام رسول شاہ میر واعظ کے انتقال پر مولانا کے مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے:

اَقانی مازھانی مِن رقاد وواعدنی علی اَمرالسھادِ

مولوی غلام رسول شاہ میر واعظ کشمیر، دینی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے اور ان کی حضرت سید علی ہمدانی کی "چہل حدیث" کی تفسیر میں انہیں جیسا کمال تھا، کم علماء کو حاصل رہا۔ مولوی شریف الدین مفتی اعظم کشمیر کی تقریر بھی جو انجمن نصرۃ الاسلام کے مذکورہ بالا سالانہ جلسے میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد بھی کشمیر میں عربی اور قرآنی علوم سے شغف جاری ہے۔ اور اس وقت سے بہت سے علماء و فضلاء یہ مشعل جلائے ہوئے ہیں۔

فارسی زبان و ادب

فارسی زبان جو کشمیر میں اسلامی عہد کے علم و فضل، ثقافت اور شعر و ادب کی ترجمان بنی، سنسکرت کے فضا سے ہٹنے کے بعد، خلاء کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ بنیادی طور پر قدیم فارسی اور سنسکرت ہم ماخذ زبانیں ہیں۔ آریائی یا ہند آیرانی، جو سنسکرت اور فارسی کا مشترک ماخذ ہے۔ جب اس کے بولنے والے دو شاخوں میں بٹ گئے اور ایک شاخ جس نے بعد میں سنسکرت کو نشو و نما دیا ہندوستان کی طرف گئی تو اس کی دوسری شاخ دردستان اور بلتستان ہوتی ہوئی کشمیر کی طرف بھی آئی تھی۔ کشمیر میں آباد ہونے کے بعد، ان ہی لوگوں کے درمیان کشمیری زبان نے نشو و نما پائی۔

فارسی کا تعارف کشمیر میں ادبی اور علمی زبان کے طور پر اسلامی عہد کے آغاز سے ہوا، لیکن وسط ایشیا سے کشمیر کے طبعی، تجارتی اور کسی حد تک سماجی تعلقات کی بدولت یہ علاقہ اس سے پہلے بھی فارسی اثر کی زد میں تھا۔ راجہ کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے عروج کے بعد کشمیر پر فارسی کے اثرات براہ راست پڑھنے لگے۔ اس میں ان ترک سرداروں کا بھی حصہ تھا، جن سے راجہ بھکشاچر نے

اپنے دشمن راجا سنسلا کے خلاف مدد لی تھی۔ اس موقف نے کشمیر میں ترک سرداروں کے اثر اور نفوذ کو مستحکم کر دیا تھا۔ محمود غزنوی نے خود بھی کشمیر پر حملہ کرنا چاہا تھا، لیکن لوہر کوٹ تک آکر رک گیا۔ تلک جو محمود کے دربار میں ملازم تھا اور ترجمانی کا کام اس کے سپرد تھا، اس کی فارسی دانی کے بارے میں شد و مد سے روایت بیان کی گئی ہے۔ اس نے فارسی کی تکمیل وسط ایشیا کے ایک عالم قاضی ابو الحسن شیروانی کے پاس کی تھی۔

کشمیر میں قدیم راجاؤں کی حکومت کی کمزوری نے فطرتاً جیسا کہ تاریخی حصہ میں تفصیل دی گئی، کچھ مہم پسندوں کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ ان میں رینچن، والئ تبت کا لڑکا، شاہ میرزا، طاہر بن نور شاہ کا بیٹا، اور لنکر چک، دردستان کے سردار کے خاندان نے اپنے وقت پر کشمیر پر تسلط حاصل کیا، فارسی سے آگاہی رکھتے تھے۔ رینچن شاہ کے زمانے میں حضرت شرف الدین عبدالرحمٰن بلبل شاہ اور مولانا احمد علامہ جیسے عالم کشمیر میں موجود تھے، جو عربی کے علاوہ فارسی سے واقفیت رکھتے تھے۔

لیکن کشمیر میں فارسی علم و ادب کی بنیادیں، شہمیری سلاطین کے زمانے میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی، اور ان کے ساتھ بہت سے سادات، علماء اور ان کے خاندانوں کے کشمیر آجانے کے بعد سے مستحکم ہوتی گئیں۔ ان علماء نے تبلیغ کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کا اثر بھی کشمیر میں فارسی کے فروغ پر مستحسن مرتب ہوا، اور رفتہ رفتہ فارسی نے علمی، ادبی اور سماجی زندگی میں ایسا مقام حاصل کر لیا کہ کشمیر "ایران صغیر" کہلایا، اور جلد ہی فارسی علم و ادب کے بڑے ستون یہاں استادہ ہو گئے۔

حضرت امیر کبیر خود بڑے عالم اور عربی کے علاوہ فارسی کے بھی مصنف تھے۔ فارسی میں ان کے لکھے ہوئے رسالوں کی تعداد بیس، بائیس کے لگ بھگ ہے۔

جن میں رسالہ معرفت، زہد، رسالہ اورادیہ، چہل حدیث، رسالہ ذکریہ، رسالہ کشف الحقائق رسالہ مکتوبات اور مناجات اہمیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی دور کے عالم شاعروں میں شیخ محمد سرائی اور میر حاجی محمد قادری نے کلام کے کچھ نمونے چھوڑے ہیں۔

شاہمیری سلسلے کے حکمرانوں میں، قطب الدین اور زین العابدین بڈشاہ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ قطب الدین فارسی میں شعر کہتا تھا۔ قطبؔ تخلص کرتا تھا۔ اس کی غزل کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

ای بگرد شمع رویت عالمی پروانہ ٭ وزلب شیرین تو شور لیست در ہر خانہ

من بہ چندین آشنائی میخورم خون جگر ٭ آشنا را حال اینست، وای بر بیگانہ

سلطان سکندر اور بڈشاہ کے دربار علماء اور شعرا کا مرکز تھے۔ سکندر نے عربی اور فارسی کی تعلیم اور دینیات کی تدریس کے لئے کئی مدرسے قائم کئے تھے۔ سلطان زین العابدین کا مدرسہ جو نوشہرہ میں وسیع پیمانے پر قائم کیا گیا تھا، کشمیر میں فارسی علم و ادب کے معیار کو بلند کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ مولوی کبیر جو سلطان کے استاد بھی تھے، اور ہرات میں رہ کر تعلیم کی تکمیل کی تھی، سلطان کے دارالعلوم کے صدر تھے، وہ نحو کے عالم بے بدل، اور شرح ملا کی تفسیر کے مصنف بھی تھے۔ دارالعلوم کے اساتذہ میں ملا پارسا کا بھی بڑا علمی رتبہ تھا۔ زہد و تقوی اور روحانی فضیلت کے اعتبار سے سید حسین منطقی کے فرزند سید محمد امین اویسی کا جو مرتبہ تھا، کم بزرگوں کو حاصل ہو سکا۔ ان سارے اوصاف کے ساتھ وہ خوش فکر شاعر بھی تھے۔ بڈشاہ انہیں نظم و نسق کے لئے تربیت دینا چاہتا تھا لیکن انہوں نے گوشہ نشینی کو ترجیح دی۔ ان کے ایک قطعہ کے چند شعر ہیں:

آزمودم جہان واہل جہان ٭ انچہ ہستند آشکار و نہان

ہمہ در بند خویشتن مشغول ٭ ہمہ در کار خویشتن حیران

نے ترحم بحالِ غمزدہ — نہ تکلّم بلطف و با احساں
جُملہ در قصہ خواں یکدگر اند — او فتادہ چو موش در انباں

مُلّا احمد کشمیری سلطان زین العابدین کے دربار کے ملک الشعراء تھے۔ انہوں نے سُلطان کے قائم کئے ہوئے دار الترجمہ کے لئے کلہن کی "راج ترنگنی" کا فارسی میں ترجمہ "بحر الاسمار" کے نام سے کیا تھا جواب ناپید ہے۔ سلطان کے اس دار الترجمہ میں سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ سنسکرت میں بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنی تاریخ کشمیر میں سلطان کے ایک کارنامے "شکایات" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان کے عہد میں بے شمار فاضل اور شاعر تھے۔ جن میں باہر سے آئے ہوئے، عالموں اور شاعروں کے علاوہ کشمیر کے علما اور شعراء کی بھی خاصی تعداد تھی، لیکن ان کے حالات ضبط تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے، اب ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔

سلطان زین العابدین نے فارسی زبان کو ترقی دینے کے لئے ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ پنڈتوں کے لڑکوں کو وظیفے دے کر مدرسے میں شریک کرواتا تھا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرتا تھا۔

سلطان زین العابدین کے بعد، سلطان حسن شاہ کے عہد میں بھی ایران اور ترکستان سے بہت سے علماء کشمیر آئے تھے۔ فارسی علم و ادب کا ذوق مردوں سے گذر کر خواتین تک بھی پہنچ گیا تھا، چنانچہ حسن شاہ کی ملکہ شاہ بیگم کو بھی علم و ادب سے لگاؤ تھا اور اس نے ایک مدرسہ اشاعتِ علم کی غرض سے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی والدہ گُل خاتون کو بھی علم کی اشاعت اور ترقی کا شوق تھا۔ زاہدہ خاتون ایک عارفہ تھیں جن کی اخلاقی کہاوتیں ملتی ہیں۔ ان کا ایک مقولہ ہے:

" ہر کہ از بود وار ہیدہ ، از اندوہ رستہ و از غم بیم جستہ "

بعد کے کشمیری سلاطین کا عہد، خانہ جنگی کا عہد تھا۔ ایسے زمانے میں علم و ادب کی خدمت کی طرف دھیان مشکل سے جاتا ہے۔ تاہم میرزا حیدر دوغلات جنہوں نے اس زمانے میں کشمیر میں اقتدار حاصل کر لیا تھا، ادب اور شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیف "تاریخ رشیدی" کشمیر کی تاریخوں میں اہمیت رکھتی ہے۔ میرزا اچھے سخن گو بھی تھے۔ ان کی ایک رباعی ہے:

یک لالہ رُخی کہ مہر افزاید نیست　　　　در مہر و وفا چنانکہ باید نیست
در گلشن کشمیر بسی خوش گل‌هاست　　　　آں گُل کہ از و بوی وفا آید نیست

چک سلاطین کے عہد میں فارسی کو پھر فروغ حاصل ہونے لگا تھا۔ چک سلاطین شیعہ عقائد کے حامل ہونے کی وجہ سے ایران اور ایرانیت سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ حسین شاہ چک نے بہت سے فارسی شعراء کی سرپرستی کی تھی، جن میں سربرآوردہ مُلا نامی اول و ثانی، بابا طالب اصفہانی، میر علی اور مولانا مہدی ہیں۔

میر علی اچھا خوشنویس بھی تھا۔ ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دِن حسین شاہ باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، میر علی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ایسے میں ایک خوشنما گلاب حسین کو پسند آیا اور اس نے اسے توڑ کر میر علی کو اپنی عنایت کی نشانی کے طور پر دیا۔ اس پر میر علی نے شعر کہا تھا۔

گُل بدستم چہ نہی در کف من خار خوش است
ایں گُلِ تازہ براں گوشۂ دستار خوش است

میر علی نے کشمیر کی تعریف میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

حسین کے بعد یوسف شاہ چک کے زمانے میں بھی شعر و سخن کا مذاق عام رہا۔ حالانکہ یہ زمانہ سیاسی خلفشار کا تھا۔ یوسف کی حُسن پسند طبیعت کو شعر سے

بہت گہرا لگاو تھا، اس کی ایک غزل کے دو شعر ہیں۔

دل پر درد من جاناں بسانِ غنچہ پُرخون است

چہ بیرحمی، نہ پرسیدی کہ احوال دلت چوں است

لیلیٰ جمازہ را بر مجنوں بخود نماند | زورِ کمندِ جذبہ معجز نمای اوست

اس کا منظوم خط بھی قابلِ ذکر ہے، جو اس نے اپنے ایک امیر علی بٹ کو لکھا تھا۔ جس نے اسے جنگ کرنے سے ڈرایا تھا۔ اس خط کے چند شعر ہیں ؛

چہ می گوئی اے گرگ آبدال رنگ | بتر سانی از آب دریا نہنگ

غضنفر پدر فر بر آورد شیر | حذر کن ز روباہ بازی گزر

بشمشیر و خنجر ترا نیست کار | کشاورز را با دلیری چہ کار

نزادہ منم دیگراں زیر دست | بر پور علی شاہ کہ آرد شکست

اس کے عہد میں مولانا احمد اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اس زمانے میں کشمیر کے قحط کا حال ایک مثنوی میں منظوم کیا تھا۔ محمد امین مستغنی، یوسف کے عہد کے سربرآوردہ شعرا میں سے تھا۔ بابا طالب، اصفہانی، جسے حسین کے عہد میں دربار کا تقرب حاصل ہوا تھا۔ یوسف کے زمانے میں بھی نمایاں تھا۔ یوسف کے جانشین یعقوب کے دربار کے شعرا میں میرزا مجرم بیگ تاشلیقی کا بیٹا، میرزا علی خاں اہمیت رکھتا ہے۔ چک سلاطین کے آخری عہد میں حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کا روحانی فیض جاری ہوا، جس سے سیراب ہوکر، فارسی کے اچھے عالم، مصنف اور شاعر کشمیر سے اُٹھے۔ خود مخدومؒ کے بھائی بابا علی رینہ فارسی کے اچھے عالم تھے۔ انہوں نے عارفوں کا ایک

بسیط تذکرہ "تذکرۃ العارفین" کے نام سے لکھا تھا۔ بابا داؤد خاکیؔ بھی حضرتِ مخدوم کے فیض یافتوں میں سے تھے، جن کے فارسی قصائد جو منقبت میں ہیں، معرکۃ الآرا ہیں "وردالمریدین" اور "دستورالسالکین" کے علاوہ "رسالہ فروریہ" اور اس کی شرح "مجموعتہ الفوائد" کے بھی وہ مصنف ہیں۔

جن صاحبِ ذوق علما نے چک عہد کے آخری زمانے میں نمود حاصل کی۔ ان میں حضرتِ شیخ یعقوب صرفیؔ کا پایہ بہت بلند ہے۔ کشمیر میں علم کی تحصیل کے بعد انہوں نے سیالکوٹ، لاہور، کابل، سمرقند، اور مشہد کے علما سے بھی تحصیل کی۔ اور مکہ میں بھی قیام کیا تھا۔ ان مقامات کے علما سے انہوں نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اکبر کے پیرِ طریقت، حضرتِ شیخ سلیم چشتی سے ان کے مراسم تھے اور سفرِ حج میں دونوں ساتھ تھے۔ صرفیؔ عارفانہ شعر کہتے تھے اور ایک دیوان چھوڑ گئے ہیں۔ مولانا جامیؔ کے انداز کا ایک خمسہ بھی ان کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ "رسالہ اذکار" "کنزالجواہر" "چہار رسالہ" اور کئی شرحیں اور حاشیے بھی ان کی تصانیف سے ہیں۔ ان کی عارفانہ غزل کا ایک نمونہ ذیل کے اشعار ہیں۔

در صد ہزار آئینہ یک روست جلوہ گر
در ہر چہ بینم آں رخِ نیکو است جلوہ گر

خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست
دیں طرفہ ترکہ دوست بہر سو است جلوہ گر

مغلوں کے تسلط کشمیر سے، کشمیر میں فارسی کی نشو و نما پر ایران کے ترقی یافتہ مذاقِ سخن کا اثر گہرا ہونے لگا۔ جس کے نتیجے کے طور پر، اگلا مذہبی اور متصوفانہ رجحان گھٹنے لگا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سربرآوردہ فارسی شعرا جیسے، عرفیؔ، فیضیؔ برہمنؔ، اور انشا پرداز ابوالفضل کا تعلق کشمیر سے رہا۔ مغل ناظموں میں کئی شعر و سخن

کے قدر دان ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر احسن اللہ، ظفر خان احسنؔ ہے جو خود فارسی کا سر بلند شاعر اور شعراء کا سرپرست تھا۔ فارسی شاعری کے اس مذاق کو جو اس زمانے میں ایران میں نشو ونما پا رہا تھا۔ ظفر خان نے ایران کے سربرآوردہ سخن سنجوں کی کشمیر میں سرپرستی کر کے، یہاں بھی مقبول بنایا۔ ان شعراء میں میرزا صائبؔ محمد جان قدسیؔ، میرزا ابوطالب کلیمؔ، میر الٰہیؔ، محمد قلی سلیمؔ، میرزا جلالہ طبا طبائیؔ، مُلا طغرائیؔ شہدی میں سے ہر ایک فارسی شعر و ادب کے آسمان کے روشن ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے قیام کشمیر کے اثر سے یہاں سے فانیؔ اور غنیؔ جیسے سربرآوردہ سخن سنج اُٹھے، جنہوں نے بلندی کا وہ معراج حاصل کر لیا، جو کشمیر کے کسی فارسی گو شاعر کو حاصل ہو سکتا ہے۔

لیکن اگلا علمی مذاق بھی نئے، شعری اور ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ چنانچہ مُلا جمال الدین، مُلا کمال الدین، مُلا حیدر، جوہر ناتھ جیسے عالم، خواجہ حبیب اللہ حبّی جیسے صوفی شاعر اور حیدر ملک چاڈورہ جیسے مورخ اور بابا نصیب الدین غازی اور بابا داؤد مشکواتی جیسے زاہد، عالم اور مُصنف، اس دیار سے اُٹھے، مُلا جمال اور مُلا کمال، شیعہ سُنی مناقشات کے دوران سیالکوٹ چلے گئے تھے۔ جہاں ان کے حلقۂ درس سے مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے جیّد عالم نشو ونما پائے۔ حبّی صاحب باطن بزرگ اور شاعر تھے۔ ان کا کلام تصوّف اور عرفان کے رموز سے پُر ہے۔ ان کے کچھ شعر ہیں:-

ای ہر کہ ترا یافتہ، او ہر دو جہان یافت
دہ ہر دو جہاں چیست، بگو بہتر ازاں یافت
ایں دولت پایندہ کہ بخشند بہ عاشق
او گرچہ گدای است ولی بہ زشہاں یافت

ای کہ بہشت بریں بے تو عذابم عذاب

آتش دوزخ ہمہ با تو گلابم گلاب

گرمی شوقت چہ کرد، نرمی ذوقت چہ کرد

سینہ کبابم کباب، دیدہ پُر آبم پُر آب

شعری لطافت کو برقرار رکھتے ہوئے صناعت شعری کا یہ انداز، ایران کے اساتذہ میں بھی کم ہی سے نبھ سکا ہے۔

حیدر ملک چاڈورہ کی تاریخ کشمیر کی دوسری فارسی تاریخوں کے ساتھ ساتھ، فارسی کے تاریخی ادب میں ایک شائستہ اضافہ ہے۔ بابا نصیب الدین غازی، صاحب باطن بزرگ تھے۔ ان کا اہم کارنامہ حضرت شیخ نورالدین ریشی کے حالات میں ہے جو "نورنامہ" کے نام سے موسوم ہے۔ بابا خوش فکر شاعر بھی تھے۔

اس عہد کے شعرائیں ذہنی، مشتری، ندیم، فہمی، روحی وغیرہ اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ ایران سے جو سخنور احسن کی سرپرستی میں یہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثروں نے کشمیر کی تعریف میں نفیس نفیس نظمیں لکھی ہیں۔ خود احسن کو جہانگیر کی طرح کشمیر سے جو عشق تھا اسے ایسے شعر کہنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ جس کے کچھ نمونے یہ ہیں۔

اگر فرصتم بخشدم روزگار — کنم رشکِ فردوس کشمیر را

بہشت بریں از شما زاہداں — بہ احسن گزارید کشمیر را

احسن کا شعری پایہ بہت بلند ہے۔ غزل اور مثنوی، دونوں اصناف میں اس کا قلم اساتذہ کی ہمعانی کے ساتھ چلتا ہے۔ اس نے غزل اور رُباعی کا ایک ضخیم دیوان اور تین مثنویاں چھوڑی ہیں۔ مثنویوں کے نام ہیں: مثنوی جلوہ ناز، مثنوی میخانہ راز، مثنوی ہفت منزل" احسن کا شاعرانہ مرتبہ اس لئے متعین نہ ہو سکا کہ اس کا کلیات اب تک منظر عام پر نہیں آیا۔ صایب اپنے آپ کو اس کے فیضِ صحبت

کا تربیت یافتہ بتاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

ہر کہ چوں من از ظفر خاں یافت فیض تربیت

می رسد گر در سخن دعوائے خاقانی کند

اور احسن کے ذیل کے اشعار سے اس کے استادانہ فکر کی تائید ہوتی ہے۔

یک دستہ گل است نگارم ز باغ حسن

حسن آفرین ز دست خود ایں دستہ بدستہ است

بلبل فغاں بیہدہ در باغ می کنی — یک نالہ بہر سوختن آشیاں بس است

عایب کا انداز کشمیر میں بہت مقبول رہا تھا۔ اور کئی شاعر اس کا اتباع کرنے لگے تھے۔

ملا محسن فانی، صرفی کے فیض یافتہ صاحب ذوق علماء میں سے تھے۔ وہ بھی ایک دیوان غزلیات و قصاید اور ایک خمسہ کے مصنف ہیں۔ ان کا دیوان شایع نہیں ہوا، لیکن چار مثنویوں کے مجموعے کو دہلی یونیورسٹی کے استاد فارسی، ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اور یہ مجموعہ کلچرل اکاڈمی سری نگر کی جانب سے شایع ہوا ہے۔ ان کا سب سے بڑا فیض یہ ہے کہ انھوں نے غنی کی تربیت کی۔ جو اپنے عہد اور ہر عہد کے فارسی سخن سنجوں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ غنی کی فکر میں ایرانی اور کشمیری ذوق اور فکر کے عناصر سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی لئے اس کے کلام سے ایک نئے آہنگ کا احساس ہوتا ہے اور اس کا مختصر دیوان اس کے بقائے دوام کی ضمانت بن گیا ہے۔

یہ دور جو احسن کے بعد سے شروع ہوتا ہے، غنی کے علاوہ نافع، جویا، گویا، فروغی، فصیحی، استغنا، جیسے خوش فکر سخن سنجوں کو نشو و نما دینے کا باعث ہوا۔

نافع غنی کے بھائی تھے، جویا اور گویا بھی دونوں بھائی تھے۔ فروغی۔

کشمیر سے باہر، شاہ جہاں کے دربار میں بھی مقام پیدا کر لیا تھا۔ فیضی کا انداز غزل میں استادوں جیسا ہے اور عبدالرسول استغنا بھی کشمیر کے ان صاحبانِ فکر و فن میں سے ہیں، جنہوں نے وطن سے زیادہ باہر نام پیدا کیا۔

دارا شکوہ اور اس کے پیرِ طریقت اخوند ملّا شاہ بدخشانی کے کشمیر میں قیام سے بھی فارسی کے ذوق کو تحریک نصیب ہوئی۔ دارا شکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا، نے اپنے پیر کے صوفیانہ مشاغل کے لئے کوہ پیر پنچال کی ایک شاخ کے ڈھلوان پر خانقاہ تعمیر کروائی تھی۔ جو بعد میں دارا شکوہ کی بیگم نادرہ بیگم عرف پری بیگم کے نام سے پری محل مشہور ہو گیا۔ یہاں منصوفانہ کتب کا ایک وسیع کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ شاہ فارسی کے بالغ نظر شاعر اور عالم تھے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ دارا شکوہ کی تصنیف "سرِ اکبر" کشمیر میں ہی لکھی گئی تھی۔

"طبقات شاہ جہانی" محمد صادق کشمیری کی ایک اہم تصنیف ہے۔ جو شاہ جہاں کے عہد میں لکھی گئی۔ محمد صادق کی ہمہ گیر طبیعت نے ایک قاموس جیسی تصنیف کی تجویز بنائی تھی۔ جس میں دورِ خلافت سے لے کر اپنے عہد تک کی تاریخ اور اولیا، فلاسفہ اور شعراء کا تذکرہ شامل کرنے کی ان کی سعی تھی۔ لیکن ان کی یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔ بلکہ کتاب صرف آلِ تیمور تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کے باوجود دورِ تیمور کا یہ عمدہ تذکرہ ہے۔ اس زمانے کے جیّد علماء میں حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کا مقام بہت اونچا ہے۔ انہوں نے عوام کی ذہنی تربیت اور علم کی اشاعت کے مقصد سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جو مدرسۂ خواجہ گانِ نقشبند کے نام سے موسوم تھا۔ خواجہ نقشبند کے فرزند خواجہ معین الدین بھی بلند پایہ عالم ہوئے ہیں۔ ان کی تصانیف "فتاویٰ نقشبند" "رسالہ رضوانی" اور "کنز السعادہ" اہم کارنامے ہیں۔

عالمگیری عہد کے علماء میں جنہوں نے فارسی میں بلند پایہ تصانیف چھوڑیں،

بابا داؤد مشکواتی سرفہرست ہیں، مشکواتی وہ اس لئے کہلاتے تھے کہ انہیں مشکوٰۃ پوری ازبر تھی۔ ان کی تصنیف" اسرار الابرار" کشمیر کے بزرگانِ دین کے حالات میں عمدہ کتاب مانی گئی ہے۔ شعراء میں میرزا عبدالغنی بیگ قبول، عبدالحکیم ساطع، شرف الدین فرحت، اور بینش اور انشا پردازوں میں مُلّا رفیع منشی اس عہد میں نمایاں ہیں۔ رفیع شعر بھی خوب کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک ہم عصر شاعر تسلّی کی بحرِ طویل میں ہجو لکھی تھی۔

اس زمانے میں کشمیر کے ملحقہ علاقے کشتواڑ میں بھی فارسی شاعری اور ادب کا ذوق نمو کرنے لگا تھا۔ وہاں کے نیم خودمختار راجاؤں میں سے مہا سنگھ اور کیرت سنگھ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مہا سنگھ پاکیزہ ذوق رکھتا تھا۔ اس کے دو شعر ہیں:-

دلا از لب بلا کردی، چہ کردی	قدم چوں لالہ کردی، چہ کردی
الا ای لالہ رُخ زاں سروِ بالا	قیامت ہا بپا کردی، چہ کردی

کیرت سنگھ کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:-

زِ قیدِ ایں و آں رستن رہائیست!

زِ خود بیگانہ گشتن آشنائیست!

مسی را کیمیا کردن، ہُنر نیست

زری را خاک کردن کیمیائیست

عالمگیر کے آخری زمانے میں میرزا اکمل الدین اکمل بدخشی، صاحبِ باطن بزرگ اور خوش فکر سخن سنج ہوئے ہیں۔ وہ علماء اور صوفیا کے سلسلۂ کاملیہ کے بانی ہیں۔ ان کے والد شاہجہاں کے عمائدین میں سے تھے۔ لیکن میرزا اکمل کو درویشی پسند تھی۔ انہوں نے مولانا رومی کے انداز کی ایک بسیط اور ضخیم

مثنوی لکھی ہے۔ جو "بحرالعرفان" کے نام سے موسوم ہے، اور چار جلدوں یا دفتر پر حاوی ہے۔ اس کے آغاز کے اشعار ہیں :۔

حمد للہ حامد و محمود! قوت و فعل خویش را معبود

از جمال و جلال خود مشحون! کرد چوں را پدید از بیچوں

جلوہ گر دانش از صفات آمد ایں صفت ہا دلیل ذات آمد

حضرت اکمل کے خلفا میں شیخ عبدالوہاب نوری، حاجی عبدالسلام قلندر، اور خواجہ اعظم دیدہ مری اونچے پائے کے عالم اور مصنف گذرے ہیں۔ عبدالوہاب نوری دو کتابوں کے مصنف ہیں ایک "فتحات الکبرویہ" دوسری "عین العرفان" اول الذکر کبرویہ سلسلہ کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ "عین العرفان" منظوم کارنامہ ہے جس میں کشمیر کے بزرگوں کے ملفوظات اور حالات کو جمع کر دیا ہے۔ اسی انداز کی ایک مثنوی حاجی عبدالسلام نے بھی لکھی ہے۔ جو "مخزن العرفان" کے نام سے موسوم ہے۔

میر کمال الدین رسوا اندرابی، عالمگیر کے عہد کے مشہور انشاء پرداز ہوئے ہیں۔ ان کے عہد کے امراء اور عمائد، ان سے رقعات لکھوانے تھے اور اس فن سے انہیں ایسا شغف ہو گیا تھا کہ وہ ایک ادارہ بن گئے تھے۔ انہوں نے بہت سے نوجوانوں کی تربیت اس فن میں کی تھی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور ان کا جو کلام اُردو میں سرانجام پایا تھا۔ اس کا حوالہ اگلے اوراق میں آرہا ہے۔

محمد رضا مشتاق کا شمار اس زمانے کے اساتذہ میں ہوتا ہے، وہ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ ان کا دیوان اور مثنوی "قضا و قدر" ان کی یادگار ہیں۔

کشمیر سے مغلوں کے تسلط کے خاتمے کے بعد جب افغان برسر اقتدار آئے تو وہ بھی کشمیر کی فارسی روایات سے بے تعلق نہ رہ سکے، تاہم یہ ذوق اب عوام کا تھا۔ اور حکمران طبقے کو اس سے زیادہ مس نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ نکھرا ہوا مذاق رکھنے والے

کئی پنڈت ادیب اور شاعر اب منظرِ عام پر آنے لگے تھے۔ افغان عہد میں ایک متضاد اوصاف رکھنے والی شخصیت نے فارسی ادب اور شاعری کی بڑی خدمت کی۔ یہ راجہ سُکھ جیون مل تھا۔ راجہ سُکھ جیون مل خود بھی شاعر تھے اور اپنے اطراف اچھے اچھے شاعروں کو جمع کر لیا تھا۔ ہفتہ میں ایک دِن اس نے شعراء کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ ان دِن محفل منعقد ہوتی اور شاعر جمع ہوتے اور دادِ سخنوری دیتے تھے۔ اس حلقے میں محمد جان بیگ ساؔمی، عبدالوہاب شاؔئق، رحمت اللہ نوؔید، مُلّا رفیع ماؔئل، مُلّا راؔجح، محمد علی متؔین، اور لعل محمد توؔفیق شامل تھے۔ یہ سب اپنے عہد کے سربرآوردہ سخن سنج تھے۔ سُکھ جیون مل کی تجویز ان سے شاہنامہ کشمیر لکھوانے کی تھی جس میں خود اس کی سرپرستی کا تذکرہ بھی شامل ہوتا۔ چنانچہ اُس نے مختلف شعراء کے ذمہ الگ الگ عہد کر دیئے تھے، جس کی پیش رفت میں شعراء نے ہزاروں اشعار کہے تھے۔ تاہم یہ "شاہنامہ" تکمیل نہیں ہو پایا۔

افغان عہد کے سربرآوردہ پنڈت شعراء میں پنڈت دیارام کاچرو خوشدِل فارسی ادب اور شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ تیمور شاہ دُرّانی کے میر منشی تھے۔ بعد میں زماں شاہ دُرّانی اور امیر الامراء وفادار خان کے بھی میر منشی رہے اور ان کی زندگی کا خاصا زمانہ کابل میں گذرا۔ کشمیر سے کابل تک کے سفر کا حال انہوں نے اپنی ایک طویل مثنوی میں بیان کیا ہے۔ راستے میں جن جن مقامات سے ان کا گذر ہوا اس کا حال بھی لکھا ہے۔ کابل میں جب کشمیر کی یاد آتی تو کہہ اُٹھتے تھے:

مرا حُبِ وطن آشفتہ تر کرد　　　نمی دانم چرا قسمت بدر کرد

ز جوشِ گریہ چشمم اچھ وَل شد　　　بہت شُد، مار شد، تالاب ڈَل شد

غزل اور قصیدہ بھی خوشدِل نے کہا ہے۔ غزل میں متصوفانہ رجحان جھلکتا ہے اور قصاید اپنے مربیوں کی مدح میں ہیں۔ انہوں نے ایک ضخیم بیاض بھی

چھوڑی ہے۔ جس کے اندراجات سے ان کے ذوق کے معیار اور ان کی دلچسپی کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خوشدل کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور وہ اچھے خوشنویس بھی تھے۔

خوشدل کے دو فرزندوں میں سے ایک بیربل کاچرو بھی فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ وارستہ تخلص کرتے تھے۔ سکھوں کے عہد میں یہ منظر عام پر آئے اور شعراء اور انشاء پردازوں میں نمایاں مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کی غزل میں قدسی کا سا انداز ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی، جس میں کشمیر کے ایک نوجوان کی داستان عشق نظم کی ہے۔ ان کی ایک تاریخ کشمیر جو "مختصر التواریخ" یا "مجموع التواریخ" کے نام سے موسوم ہے، سکھوں کے عہد کی مستند تواریخ میں شمار کی جاتی ہے۔

خواجہ عبدالکریم اس زمانے کے علما میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیف "بیان واقع" نادر شاہ کے عہد کے حالات اور مشاہدات کا ایک عمدہ مرقع ہے۔ وہ کشمیر سے حج کے لئے چلے تھے۔ اسی زمانہ میں دہلی میں نادر شاہ کے دار و گیر کا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ لیکن عبدالکریم نادر کے دربار میں باریاب ہوئے اور نادر ان کی صلاحیتوں سے ایسا متاثر ہوا کہ اپنی ملازمت میں رکھ لیا، بعد میں وہ حج کو گئے اور کشمیر لوٹ کر "بیان واقع" کی تکمیل کی۔ ان کی ایک اور تصنیف "عبرت مقال" کے نام سے موسوم ہے۔

افغان عہد کے آخری دور کے شعراء میں میر احسن اللہ خان راضی اچھی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی ایک مثنوی جو ملا عبدالنبی خان کشمیری المخاطب بہ محتوی خان کے برپا کئے ہوئے فتنہ کے بارے میں لکھی گئی ہے، اس کو خواجہ اعظم دیدہ مری نے شہر آشوب سے موسوم کیا ہے۔ راضی کے معاصرین میں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری اپنی تاریخ "واقعات کشمیر" کی بدولت شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ خواجہ اعظم اچھے شاعر بھی تھے۔

عبد الغفور شوپیانی نے اسی زمانے میں اپنی مثنوی "پنج گنج" لکھی تھی جس میں معروفت کے رموز اور نکات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے ہمعصر خواجہ نیاز نقشبندی شاعری میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کی مثنوی "چائے نامہ" جو چائے کی توصیف میں ہے۔ ایک تمثیلی نظم ہے اور ان نظموں میں جو کشمیر کے شعراء نے چائے کی تعریف میں لکھی ہیں، ایک مقام رکھتی ہے۔ نظم کی معنویت کے بارے میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"وفی الحقیقت از نعمت بہ منعم پی برون واز
مجاز بہ حقیقت راہ طی کردن است ـــ"

چائے کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چو او زیبا نگاری در جہاں نیست | بہ عالم مثل او آرام جاں نیست
بود پیر و جواں مشتاق رویش | گدا و پادشہ در آرزویش

مُلا حیدر رشلو افغانوں کے آخری عہد کے علماء میں امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "نور السراج" "مفتاحُ الرحمۃ"، "مصباحُ الظُلمۃ" "مرفع الغزلان" "غرایب الغرایب" "دُرِ یتیم"، "رسم خط قرآن"، "شرح چہل وچار حدیث" اہمیت رکھتی ہیں۔

سکھوں کے تسلط کے زمانے میں پنڈت بیربل کاچرو کے علاوہ پنڈت شنکر جیو آخون "پنڈت مکند رام ہنڈو" اور آنند رام بیخود پنڈت شعراء میں منظر عام پر آئے اور علماء میں میر محی الدین اکمل، بابا کمال الدین، شیخ احمد تارہ بلی، شیخ محمد تارہ بلی، خواجہ امیر الدین پکھلی وال، مرجع خاص وعام رہے۔ شعراء میں مُلا عبید اللہ کے شاگردوں مصطفےٰ خان بختور، بابا محمد کاظم اور خاص طور پر مرزا مہدی مجرم فضا پر چھائے ہوتے تھے۔ مجرم بڑی عمدہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے جو غزلوں کے علاوہ قصائد رُباعی اور مثنوی پر مشتمل ہے۔

ان کی غزل کے کچھ شعر ہیں:

شمعم کہ بہر محفل می سوزم دیلسازم — نم از مژہ غم در دل اندوزم آنلازم

از نرگس فتانت مخمورم و مفتونم — یا سنبل پیچانت ہمروزم و ہمرازم

بہاء الدین متو صوفی بزرگ اور شاعر تھے۔ غزل صوفیانہ انداز میں کہتے تھے۔ لیکن ان کا خمسہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جو "ریشی نامہ" "سلطانیہ" "غوثیہ" "نقشبندیہ" اور "چشتیہ" پانچ مثنویوں پر مشتمل ہے۔ حمید اللہ شاہ آبادی ایک اور صوفی شاعر ہوئے۔ جو روح عصر کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ان کی تصنیف "بے بوج نامہ" سکھوں کے جور و زیادتی کی ایک پیروڈی ہے۔ ان کی ایک نظم "چائے نامہ" بھی اس موضوع کی نظموں میں اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ سعدی کی "بوستان" کے انداز پر انہوں نے مثنوی "شکرستان" لکھی تھی۔ "بلیبوج نامہ" نثر میں ہے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"دریں ایام حسرت فرجام از چرخ چرخ ستمگر و سفلہ پرور در خطۂ کشمیر، جنت نظیر از تصرف خان خاناں سموالمکان و نواب عادل خاں بدر رفتہ و بر ملازمان راجہ راجگاں سلطان شہر ناپرساں تاراج سنگھ مسلم گردیدہ و حریص سنگھ کہ در رعیت پروری و عدالت گستری از بندگان عالی نامی بود و از ہمہ گرامی بخدمت صوبہ داری مشرف گشتہ از بسکہ شفقت رعایا و برایا مرکوز خاطر عدالت و خار بود ہنگام و داعش مواعیظ کافی و اندازہائی وافی نمودہ فرمودند . . . . . برمال قطاع الطریق را اجازت دہند کہ بے محابا بکار خود مشغول شوند . . . . شامت سنگھ چہرہ نویس، مردار سنگھ خزانچی، چرکین داس آشپز رہزن باندی دربان . . . . "

اسی طرح مختلف عہدوں پر متقرر کرنے کے لئے طنزیہ خطابات دیئے ہیں :

پنڈت کاشکاری لچھمن، جن کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا، اچھے شاعر تھے۔

شیخ طیب رفیقی ایک صاحبِ کشف وکرامات بزرگ تھے، جنھوں نے "رفقا الفقرا" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ کشمیر کی عارفہ خواتین میں روپ بھوانی، فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ اپنے معتقد بھائی کے منظوم خط کے جواب میں انہوں نے بھی ایک منظوم خط بھائی کو لکھا تھا جس کے چند شعر ہیں :

دِل پسندا فضل حق یار تو باد	درحریم خاص دِل بار تو باد
گربصورت دوری از ہجرم منال	لیک درمعنی بمن داری وصال
ہیچ دوری نیست از ما تا بہ تو	درمیاں گرہست منزلہا بتو
نورہ من بنگر ہرجا جلوہ گر	عالم درحیوان وخاصہ دربشر

آنند رام بےخود شستہ شعر کہتے تھے اور کلام کا انداز اُستادانہ ہے :

ڈوگرہ عہد میں فارسی شعراء اور ادیبوں کی کوئی ہمت افزائی نہیں ہوئی، تاہم ابتداً فارسی درباری زبان تھی، اور شعر وادب کا ذوق جو اس سرزمین میں نشوونما پا چکا تھا۔ اس کے بل بوتے پر فارسی میں لکھنے کی روایت جاری رہی شعراء میں پنڈت راجہ کول ویری، ست رام بقایا، پنڈت گوپال غیوری، ابتدائی ڈوگرا دور کے شعراء میں قابل ذکر ہیں۔ ویری صاحبِ دیوان ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وزیر کرپارام فارسی میں انشا پردازی کرتے تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں، جن میں "گلاب نامہ" قابل ذکر ہے، جو قدیم اساتذہ کے انداز میں مسجع اور مرصع اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس کے آغاز کے چند سطور ہیں :

"گلاب افشانی سخن وعنبر بیزی کلام شاہوار بارگاہِ سلطان السلاطین سزاست کہ خطیب از خطبہ ابدی بنام نامی حضرت جل جلالہ وعم نوالہ

آسماں خوانده . . . . "

پنڈت دامودر ترسل غزل کہتے تھے، لیکن ان کا ایک "شہر آشوب" بہت مشہور ہوا تھا۔

پنڈت شعرا میں سے بعض نے اس زمانے میں بھاگوت گیتا کے فارسی میں منظوم ترجمے کئے تھے۔ ان میں پنڈت گوپال کول غبوری کا بھاگوت کے دشم اسکند کا ترجمہ اور غالباً نارائن جو کا کیا ہوا بارہ اسکند کا ترجمہ قابل ذکر ہے۔ مُلا نورالدین کی "مولود النبی" اور پنڈت طوطارام بٹ برہمن کی ایک طویل مثنوی، اسی زمانے کے دوسرے قابل ذکر کارنامے ہیں۔ طوطارام نے مہابھارت کو بھی فارسی میں منظوم کیا تھا۔ پیرزادہ غلام حسن کھویہامی نے اسی زمانے میں اپنی یادگار تاریخ کشمیر "تاریخ حسن" کے نام سے چار جلدوں میں مرتب کی۔ ان کے والد حافظ غلام رسول شیوہ بھی شاعر اور انشا پرداز تھے اور بھائی، مُلا حبیب اللہ سہروردی نے ایک منظوم تاریخ اسلام لکھنی شروع کی تھی۔ جو "تاریخ جدید" کے نام سے موسوم ہے۔ پنڈت شبوجی در کی "تاریخ کشتواڑ" بھی اس زمانے کی تصانیف میں قابل ذکر ہے۔

ابو محمد خواجہ حسن شعری سربرآوردہ عالم اور خوش فکر شاعر تھے۔ اور فارسی کے کئی نوجوان شعرا نے ان کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا تھا۔ پنڈت واسہ کول اوگرہ بُلبل، اپنی گوناگوں ادبی تخلیقات کی وجہ سے اس عہد کے شعرا میں نمایاں ہیں۔ وہ صاحب دیوان تھے، اس کے علاوہ تین ضخیم مثنویاں "چہار درویش"، "گلزار بُلبل" اور "گلشن عندلیب" ان کی یادگار ہیں۔ بخشی دیارام کاچرو، پنڈت بلکاک فوتہ دار سرور، پنڈت دیارام رینہ شاد، پنڈت بلبدر جو بدر، اس عہد کے دوسرے سخن سنج ہیں۔ احمد میرانی نے "جواہر المنظوم" کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی تھی۔ عبدالنبی خانیاری کشمیر کی تاریخ "وجیز التواریخ" کے مصنف ہیں۔

ایک اور مورخ میرزا سیف الدین بھی اسی زمانے میں ہوئے ہیں۔ وہ میرزا آصف وقائع نویس کے فرزند تھے۔ والد کے بعد یہ بھی اسی عہدہ پر مامور رہے اور ایک تاریخ کشمیر "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے لکھی تھی۔ ان کے خاندان میں میرزا جلال الدین بھی ہوئے ہیں جو فارسی کے خوش فکر شاعر تھے اور ایک مثنوی "حسن و گوہر" کے نام سے لکھی تھی۔

کشتواڑ، جو کشمیر کے توابعات سے ہے، قدیم زمانے سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ حکیم غلام محی الدین محی کشتواڑی شاعر اور مُصنّف تھے۔ ان کی "تاریخ کشتواڑ" اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر جن میں کشتواڑ کی تعریف کی گئی ہے ذیل میں درج ہیں :

خوشا دلکش دیار کشتوار است | بہر ماہ نوش جام صد بہار است
بہر سو نرگس بیمار مخمور | مسیحا دم صبا بیمار دار است
نہ چوگاں بلکہ خوش بستان جنت | ز سور نجاں بساطش از نگار است

پنڈت ہر کول، "گلشن عشق" کے مصنف تھے۔ جو مشہور داستان "گل بکاؤلی" کا منظوم ترجمہ ہے۔ خواجہ شاہ نیاز اور خواجہ محمد شاہ نقشبند شاعر ہوئے ہیں۔

ہمارے اپنے عہد میں بھی سرزمین کشمیر کئی خوش فکر شعراء کے نغموں سے معمور ہے۔ ان میں مولانا شمس الدین حیرت کاملی، کہنہ مشق شاعر اور اُستاد تھے۔ جن کا انتقال حال ہی میں ہوا۔ ان کی غزل متصوفانہ ہوتی ہے اور وہ ضخیم مثنوی "فسانۂ حیرت" کے بھی مُصنّف ہیں۔ جس میں اپنے عہد کے حالات نظم کئے ہیں۔ حیرت کا انتقال پچھلے سال ہو گیا۔

موجودہ شعراء میں خواجہ محمد امین درابو داراب، فارسی کے نغز گفتار شعراء کے ایک طویل سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اسلاف میں کئی اچھے شاعر ہو گئے ہیں۔ خود داراب کا مقام موجودہ دور میں ہندوستان کے فارسی شعراء میں

بہت بلند ہے۔ عرفان وحکمت کے مسائل ان کی فکر کے محرک ہیں۔ اس کے ساتھ اپنے عصر کے مسایل کا شعور بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ ان کا بہت سا کلام اقبال کی "زبور عجم" کے جواب میں سرانجام پایا ہے۔ چند شعر ہیں:

سروم مرا تو یار خدایا ثمر بدہ
چوں نخل شمع سوزِ دل وچشم تر بدہ
درجام زادہ صدف بحر طبع مَن
آبی کہ ریختہ نشو وچوں گہر، بدہ

تو زِ فلسفہ چہ کوشی کہ کشائی عقدۂ من
چو ہنوز پی نبردہ ملک و فلک بہ رازم

انگریزی

کشمیر کے اہلِ قلم اپنی فکر و فن کے سفر میں انگریزی کی سرمنزل تک جدید عہد میں پہنچے۔ جب انگریزی کی تعلیم عام ہو چکی تھی بلکہ اس کو جاری ہوئے عرصہ گذر چکا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے استحکام کے بعد، فارسی کا اثر جس طرح گھٹنے لگا تھا اور اس کی جگہ جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے، اُردو لینے لگی تھی اور رفتہ رفتہ انگریزی رائج ہوتی گئی۔ جموں و کشمیر میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ لیکن ہندوستان کے مقابلے میں کافی عرصہ بعد ــــ نظم و نسق میں انگریزی کے داخل ہو جانے کے بعد، جو طبقے انگریزوں سے قریب تھے یا ان سے قربت حاصل کرنا چاہتے تھے، انگریزی کو اپنا واسطہ بنانے کی طرف مائل ہونے لگے۔ کشمیری پنڈتوں کا طبقہ اس سلسلے میں پیش پیش رہا۔ کشمیر کے لکھنے والوں کو انگریزی میں لکھنے کی ترغیب کا ایک سبب وہ سیاح اور مستشرقین بھی تھے، جو یورپ اور انگلستان سے کشمیر آتے تھے، اور کشمیر کے بارے میں تصنیف و تالیف کرتے تھے۔

کشمیر میں انگریزی تصنیف و تالیف کا آغاز، پریم ناتھ بزاز کے بیان کے مطابق، آنند کول بامزئی سے ہوا، جنھوں نے "دی کشمیری پنڈت" کے نام سے ایک کتاب ۱۹۲۵ء

ــــــــــــــــ

لہ: THE KASHMIRI PANDIT

میں لکھی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے دو سال قبل پنڈت رام چندر کاک کی کتاب
سری پرتاپ سنگھ میوزیم کے آثار قدیمہ اور سکوں[1] کے بارے میں اس سے دو سال
پہلے اور کشمیر کے آثار پر ایک سال قبل شایع ہو چکی تھی۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء میں
پنڈت گوا شہ لال کول کی "کشمیر تھرو ایجز[2]" بھی شایع ہوئی۔

ان دونوں مصنفین سے بہت پہلے، اُردو کے شاعر، مصنف اور صحیفہ نگار
پنڈت سی ایم سالک نے انگریزی میں ایک رسالہ "دی ریجن آف ٹرر ان کشمیر[3]"
کے نام سے نکالا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۸۹۴ء میں شایع ہوا تھا۔ اس زمانے میں
مہاراجہ کے دربار ریاست میں اخبار یا رسالہ نکالنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔
اس لئے سالک نے اسے غالباً لاہور سے شایع کیا تھا۔ اس میں سردار محمد حیات خان
کے خلاف مضامین شایع کئے تھے۔ سردار اس زمانے میں ریاست کے وزیر تھے۔ اور
۱۸۹۳ء میں انہوں نے سالک کو سیاسی سرگرمیوں اور پریس اور اخبار جاری
کرنے کی جدوجہد کی وجہ سے، جموں سے باہر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے سالک
ان کے مخالف ہو گئے تھے، اور ان پر یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہ کشمیری پنڈتوں کو
ملازمت سے برخاست کر کے، اپنے ہم مذہب لوگوں کو ریاست کی ملازمت
میں بھرتی کر رہے ہیں۔ سالک نے انگریزی میں مہاراجہ گلاب سنگھ کی ایک سوانح عمری
بھی لکھی تھی[4] جو ان کی اُردو میں لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے
کشمیری زبان کی قواعد اور ریڈریں بھی لکھی تھیں۔ ریڈروں کے پہلے ایڈیشن میں

---

1. HAND BOOK OF THE ARCHEOLOGICAL AND NUMISMATIC SRI PARTAP SINGH MUSEUM SRINAGAR. 2. KASHMIR THROUGH AGES. 3. THE REIGN OF TERROR IN KASHMIR. 4. MAHARAJ GULAB SINGH.

انہوں نے کشمیری کی مخصوص اصوات کے لئے کچھ نئی علامتیں بھی استعمال کی تھیں، جو بعد کے ایک اور اڈیشن میں ترک کر دی گئیں۔ سالک کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہوا۔

رائے بہادر رام چند کاک کشمیر کے اچھے عالموں میں سے ہیں۔ ابتدا میں وہ ایک کالج کی لائبریری کے نگران تھے، لیکن بعد میں ریاست میں محکمۂ آثار قدیمہ کے مہتمم ہو گئے تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے سر بی۔ این۔ راو کے استعفےٰ کے بعد اپنی دست برداری سے ایک سال پہلے، ۱۹۴۵ء میں، ریاست میں آزادی خواہوں اور ذمہ دار حکومت کی جدوجہد کو دبانے کے لئے، کاک کو وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ ان کا قیاس یہ تھا کہ باہر کے عہدیداروں کے مقابلے میں، ایک کشمیری، بحیثیت وزیر اعظم کے اپنے اہل ملک سے بہتر طریقے پر نبٹ سکتا ہے۔ لیکن کاک نے استبداد کا جو رویہ اختیار کیا، وہ نہ صرف اس کی ناکامی، بلکہ مہاراجہ ہری سنگھ کی بھی بدنامی کا باعث ہوا۔ "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ اور دوسرے سال ہری سنگھ کشمیر سے چلے گئے۔ کاک پہلے ایک کالج میں لائبریرین تھے، بعد میں اپنی ہوشیاری اور ذہانت کی وجہ سے مہاراجہ کے دربار سے متعلق ہو گئے تھے۔ آثار قدیمہ میں انہوں نے شائستہ خدمات انجام دیں۔ انہیں موضوعات پر انہوں نے دو کتابیں لکھیں۔ جن میں ایک۔ آثار قدیمہ اور سکوں کے بارے میں ہے جو ۱۹۲۳ء میں شایع ہوئی۔ اور دوسری کشمیر کے آثار قدیمہ کے جائزے پر[1]، جس کی اشاعت کا ۱۹۲۴ء ہے۔

پنڈت گوانشہ لال کو تاریخ اور کشمیر کے تہذیبی حالات سے دلچسپی تھی، ان کی کتاب "کشمیر تھرو ایجز" کا پہلا اڈیشن ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا۔ کتاب ۳۲ فصلوں پر مشتمل ہے، جو کشمیر کے جغرافیہ، تاریخ، حالات حاضرہ اور تہذیب کی تفصیلات پر حاوی ہیں۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اب تک اس کے

---

[1] MEMOIRS OF THE ARCHEOLOGICAL SURVEY IN KASHMIR

سات اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ ساتواں اڈیشن ۱۹۶۷ء میں شایع ہوا۔ ان کی ایک اور کتاب مختصر تاریخ کشمیر[۱] بھی ہے، جو ۱۹۳۳ء میں مرکنٹایل پریس لاہور سے شایع ہوئی۔

پنڈت آنند کول بامزئی، جن کی کتاب کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اچھے عالم تھے۔ اور ان کی دلچسپیاں وسیع تھیں۔ انہوں نے کشمیری پنڈتوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی[۲]، جو ۱۹۲۴ء میں شایع ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مقالات اور رسالے لکھے ہیں۔ حیات نند ریشی[۳]، للہ واکھیانی، حیات ریشی پیر، حیات روپا بھوانی۔ ان کی ایک اور تصنیف للہ جوگیشوری پر لکھی گئی ہے[۴]۔ انہیں کشمیر کے آثار قدیمہ سے بھی دلچسپی تھی اور اس موضوع پر بھی وہ لکھتے تھے۔

پنڈت شیو ناتھ کول نے کشمیر کے جنگلات اور ان کی پیداوار پر ایک رسالہ[۵] مرتب کیا تھا، جو ۱۹۲۸ء میں پرتاپ اسٹیم پریس، سری نگر سے شایع ہوا۔

سردار کے۔ ایم۔ پانیکر، مشہور ماہر تعلیم اور مصنف، کشمیری تو نہیں تھے۔ لیکن وہ کشمیر سے کئی حیثیتوں سے متعلق رہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے معتمد رہے۔ اس سے پہلے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تاریخ کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ سفارتی خدمات بھی ان کے تفویض رہیں۔ وہ ملیالم کے ادیب بھی تھے۔ ۱۹۶۲ء و ۱۹۶۳ء میں وہ جموں و کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ان کی تصنیف ڈوگرہ عہد کے ایک اہم موضوع، یعنی ریاست کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ

۱۔ A SHORT HISTORY OF KASHMIR ۲۔ HISTORY OF THE KASHMIRI PANDITS

۳۔ LIFE OF NUNDA RISHI ۴۔ LALLA JOGESHWARI ۵۔ THE PRODUCTS OF THE FORESTS OF KASHMIR

اور سلطنت کے قیام میں ان کی مساعی سے متعلق ہے۔ یہ ۱۹۳۱ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ[۱]، بانی سلطنت کشمیر کے نام سے شایع ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں اس کا ترمیم شدہ اڈیشن "فونڈنگ آف اے کنگڈم"[۲] کے عنوان سے چھپی۔ سردار پانیکر صاحب اسلوب بھی تھے اور کشمیر پر انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں میں اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

جس سال سردار پانیکر کی کتاب گلاب سنگھ کے بارے میں شایع ہوئی ایک کشمیری پنڈت ارجن ناتھ سپرو نے اسی سے ملتے جلتے موضوع یعنی ریاست جموں و کشمیر کے قیام[۳] پر شایع کی۔ ایک اور کتاب کشمیر کی معاشیات کے ایک مخصوص پہلو یعنی غذائی اجناس کے موضوع پر پنڈت جیالال کول جلالی نے شایع کی تھی۔

"راج ترنگنی" کشمیر کے مشہور سنسکرت عالم پنڈت کلہن کی منظوم تاریخ یورپی، ہندوستانی اور کشمیری مصنفین اور محققین کو دعوت فکر دیتی رہی ہے۔ پنڈت رنجیت سیتارام نے اس کے مطالب کو ۱۹۳۵ء میں کتاب کی صورت میں مدون اور شایع کیا تھا[۴]۔ آر۔ ایس۔ پنڈت نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب "ریور آف کنگس" کے نام سے شایع کی۔ "راج ترنگنی" ہی کے ایک خاص پہلو یعنی بھٹوں[۵] کے بارے میں دیارام نے ایک مستشرق اے۔ ایچ۔ فرانکی کے تعاون کے بارے میں لکھی تھی جو ۱۹۰۸ء میں شایع ہو چکی تھی۔

پنڈت سوم ناتھ در نے کشمیر کے مناظر اور اس کی خوبصورتی کے بارے میں

۱: MAHARAJA GULAB SINGH FOUNDER OF THE KASHMIR KINGDOM

۲: FOUNDING OF A KINGDOM.

۳: BUILDING OF JAMMU AND KASHMIR STATE

۴: RAJATARANGNI, SAGA OF THE KINGS OF KASHMIR

۵: REFERENCES TO BHARAC OF BAHGUTAS IN RAJTARANGNI ... KASHMIR.

ایک کتاب "کشمیر۔ ایڈن آف دی ایسٹ [ملے]"، کے نام سے لکھی تھی، یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کے مقدمہ کے ساتھ کتاب محل الہ آباد سے ۱۹۴۵ء میں شایع ہوئی۔

سمسار چند کول، جو ایس۔ ایم۔ ایس ہائی اسکول کے مدرس ہیں۔ انگریزی میں سیاحوں کی رہنمائی اور دلچسپی کے موضوعات پر کئی مختصر رسالوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ برڈز آف کشمیر [شے] (۱۹۳۸، ۳۹) ۲۔ پہلگام اینڈ اِٹس انوائرنز [سے]
۳۔ سرینگر اینڈ اِٹس انوائرنز [ہے] (۱۹۴۲ء) ۴۔ دی بیوٹی فل ویلی آف کشمیر [شے] (۱۹۴۲ء)
۵۔ دی مسٹیریس کیوز آف امرناتھ اینڈ کھیر بھوانی شرائن [ھے] (۱۹۵۴ء)
۶۔ گلمرگ اینڈ اِٹس انوائرنز [شے] (۱۹۵۸ء)

ڈاکٹر رادھاکشن کھان۔ ایس۔ پی۔ کالج سری نگر میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے کشمیر کے کئی معاشیاتی پہلوؤں پر جائیزے مرتب کیے تھے۔ یہ قالین [شہ] کی صنعت، گبہ [شہ] چاندی کی مصنوعات [لے] اور لکڑی پر نقش کاری اور اس کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ ان جائیزوں کی اشاعت ۱۹۳۸ء میں حکومت کی جانب سے عمل میں آئی تھی۔

پروفیسر جیا لال کول، جو ریاست کے مختلف کالجوں میں انگریزی کے پروفیسر اور پرنسپل رہے، اور کلچرل اکادمی کی معتمدی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ انگریزی اور کشمیری کے اچھے عالم ہیں اور کشمیری زبان کی ترقی سے انہیں گہری دلچسپی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں

لے KASHMIR—EDEN OF THE EAST ۲ـہ BIRDS OF KASHMIR

ـسہ PAHALGAM AND ITS ENVIRONS ؏ SRINAGAR AND ITS ENVIRONS

ـشہ THE BEAUTIFUL VALLEY OF KASHMIR ـھ THE MYSTERIOUS CAVES OF AMARNATH

ـشہ AND KHIR BHAWANI GULMARG AND ITS ENVIRONS (باقی حاشیہ صہ پر)

میں کشمیری شاعری کے ایک پہلو پر "کشمیری لی رکس[1]" کے عنوان سے ان کی کتاب شایع ہوئی۔ غالب کے منتخب کلام کی ایک شرح بھی انھوں نے لکھی اور ۱۹۶۰ء میں ان کی ایک کتاب "اسٹڈ بزان کشمیری" کے عنوان سے شایع ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کے تاریخی مقدمہ پر ایک کتاب "کشمیر آن ٹرائیل[2]" کے نام سے شایع ہوئی۔ جس پر پنڈت نہرو نے مقدمہ لکھا ہے۔ یہ کتاب لاہور کے لائینز پریس سے چھپی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ایک کتابچہ حکومت کی جانب سے "کشمیر بیفور ایکسیشن[3]" کے نام سے لاہور ہی سے شایع ہوا تھا۔

کشمیر کی تاریخ پر انگریزی میں کئی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں۔ لیکن تفصیل اور ترتیب کے نقطۂ نظر سے صرف دو کتابیں ایسی ہیں، جو اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کی "کشیر[4]" ہے۔ جو دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔ دوسری پرتھوی ناتھ کول بامزئی کی "ہسٹری آف کشمیر[5]"۔ ان میں پروفیسر محب الحسن کی تاریخ جو کشمیری سلاطین کے عہد سے متعلق ہے، اور ایک محققانہ کارنامہ ہے۔ اس وجہ سے شامل نہیں ہے کہ وہ صرف ایک عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ صوفی اور بامزئی کی تاریخیں دونوں کسی قدر مختلف نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ صوفی کی تاریخ ترتیب اور تنظیم کے لحاظ سے شاید بامزئی کے کارنامہ کو نہ پہنچ سکے۔ لیکن ایک محقق اور طالب علم کے لئے تلاش اور تحقیق کی زیادہ رہنمائی کا مواد ہے۔ بامزئی نے ہندوستانی تہذیب اور تاریخ سے اسے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔ صوفی کی تاریخ ۱۹۴۸ء

1. KASHMIRI LYRICS
2. KASHMIR. IN TRIAL
3. KASHMIR, BEFORE ACCESSION
4. KASHIR
5. HISTORY OF KASHMIR.

میں مرتب ہوئی اور اس کے چودہ سال بعد باآمزئی کی تاریخ لکھی گئی ۔ دونوں نے تاریخی معلومات کے علاوہ تہذیبی، علمی اور ادبی امور پر تفصیل سے لکھا ہے۔

پریم ناتھ بزاز وادی کے مشہور سیاسی رہنماؤں میں سے ہیں۔ وہ کشمیر کے اولین صحیفہ نگار بھی ہیں۔ انگریزی میں انہوں نے کئی کتابیں اور متعدد رسالے لکھے ہیں۔ کشمیر کے اندرونی حالات[۱] پر ان کی ایک تصنیف ہے۔ آزاد کشمیر[۲] کشمیر میں آزادی کی جدوجہد[۳] اور کشمیر کی مشہور خواتین[۴] پر بھی ان کی تصانیف ہیں۔ ایک اور تصنیف "کشمیر ان کروسیبل"[۵] بھی ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ انہوں نے کشمیر کی سیاست اور تہذیب پر کئی چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے ہیں۔

جموں و کشمیر کے جغرافیہ پر، گاندھی میموریل کالج، سری نگر کے شعبہ جغرافیہ کے صدر پروفیسر ایس۔ این۔ رینہ نے "اے جیوگرافی آف جموں اینڈ کشمیر"[۶] کے نام سے لکھی ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اسی سنہ میں اس کالج کے معاشیات کے شعبہ کے صدر نے بھی کشمیر کی معاشیات[۷] پر ایک رسالہ مرتب کر کے شائع کیا۔

ریاست میں سماجی تعلیم[۸] کے بارے میں ایک رسالہ اسی زمانے کے ناظم تعلیم سید اسداللہ کاظمی نے مرتب کیا تھا جو سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ آیسہ اور کنا۔ بچہ جو ریاست کے چیف سیکرٹری کے دفتر سے سنہ ۱۹۵۵ء میں جموں میں کاروبار اور تجارت[۹] کے موضوع پر مرتب اور شائع ہوا۔

۱۔ INSIDE KASHMIR ۲۔ AZAD KASHMIR

۳۔ HISTORY OF STRUGGLE FOR FREEDOM IN KASHMIR ۴۔ DAUGHTERS OF VITASTA

۵۔ KASHMIR IN CRUCIBLE ۶۔ A GEOGRAPHY OF JAMMU AND KASHMIR

۷۔ KASHMIR ECONOMICS ۸۔ SOCIAL EDUCATION IN JAMMU AND KASHMIR

۹۔ TRADE AND COMMERCE IN JAMMU AND KASHMIR.

پنڈت جیا لال کلم جو کشمیر کے سربرآوردہ اہلِ علم اور ماہر قانون ہیں اور ریاست کی عدالتِ عالیہ کے صدر جج بھی رہ چکے ہیں۔ کشمیر کے پنڈتوں کی تاریخ[۱] پر ایک کتاب، بڑی حد تک غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے مرتب کی ہے۔

پرتھوی ناتھ کول بامزئی جن کی تاریخ کشمیر کا اوپر تذکرہ گذر چکا ہے۔ ایک اور کتاب "لیک سکسیس سے تاشقند تک[۲]" کے موضوع پر کشمیر کی سیاست کے ارتقاء پر حال میں شائع کی ہے۔

ایس۔ ایل سادھو، محکمہ تعلیم کے تجربہ کار جو اس وقت گورنمنٹ کالج بارہمولہ کے پرنسپل ہیں۔ کشمیر کے قدیم ادب اور لوک ادب پر دو اہم کتابوں، راج ترنگنی کے قصوں[۳] اور کشمیر کی لوک کہانیوں[۴] کے مجموعے کے مرتب ہیں۔ راج ترنگنی کے قصوں کا مجموعہ، خواجہ غلام محمد صادق، وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر کے پیش لفظ کے ساتھ، ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

لالہ ملک راج صراف، جو جموں اور کشمیر کے اولین صحیفہ نگاروں میں سے ہیں، انہوں نے صحافت میں اپنے پچاس سالہ تجربوں[۵] پر ایک اہم کتاب ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے شائع کی۔ اس کتاب سے کشمیر میں صحافت کے آغاز اور ارتقاء پر بہت مفید روشنی پڑتی ہے۔ لالہ ملک راج صراف نے اپنا ہفتہ وار اخبار "رنبیر" ۱۹۲۴ء میں جاری کیا تھا۔ ان کے فرزند سورج صراف بھی انگریزی میں ایک کتاب "گلمپسز آف جموں[۶]" کے مصنف ہیں۔

ماسٹر زندہ کول، کشمیری کے مشہور بھگت شاعر پرمانند کے کلام کے مجموعے اپنے بسیط مقدمہ اور تنقیدی جائزے کے ساتھ تین جلدوں میں مرتب اور شائع کیے۔

۱۔ KASHMIRI PANDIT ۲۔ FROM LAKE SUCCESS TO TASHKAND ۳۔ TALES FROM RAJTARANGNI ۴۔ FOLK TALES FROM KASHMIR. ۵۔ FIFTY YEARS AS A JOURNALIST ۶۔ GLIMPSES OF JAMMU.

ج۔ این۔ گنہار اور پی۔ این گنہار کی تصنیف "لداخ اور کشمیر میں بدھ مت[۱] تاریخ اور تفسیر مرتب کی ہے جس کا مقدمہ، ڈاکٹر کانجو نے لکھا ہے۔ او۔ این۔ کاک، جو ریاست کے ایک سکول میں مدرس رہے۔ اور اس وقت ایک ہائی سکول کے صدر ہیں۔ بخشی غلام محمد سابق وزیر اعظم ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں ایک کتاب، بخشی غلام محمد میری نظر میں[۲]" کے عنوان سے مرتب کی، جس کا مقدمہ خواجہ شمس الدین، سابق وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر کا لکھا ہوا ہے۔ بخشی صاحب پر ایک اور کتاب ادمکار ناتھ کول نے "خالد کشمیر[۳]" کے نام سے لکھی ہے۔

حبیب اللہ کاملی، جو پہلے ریاست میں مہتمم مردم شماری کے عہدہ پر فائز رہے تھے اور اس وقت ریاست کے پبلک سروس کمیشن کے رکن ہیں۔ ریاست کی مردم شماری کی رپورٹ[۴] ۱۹۶۹ء میں مرتب کی، ان کی ایک اور کتاب دستکاری مصنوعات[۵] کشمیر پر بھی شایع ہو چکی ہے۔

پروفیسر پی۔ این۔ پشپ، سنسکرت کے عالم، جو ریاست کے محکمہ تعلیم میں کئی کالجوں کے پروفیسر اور پرنسپل کے عہدہ پر بھی فائز رہے، کشمیر میں سنسکرت شاعری[۶] شعریات[۷]، کشمیری ادب میں طنز[۸] جیسے مختلف موضوعات پر مقالے لکھے۔ جو اوریئنٹل کانفرنس اور دوسری علمی مجلسوں میں پڑھے گئے۔ اور ان کے کچھ مقالات حکومت ہند کے محکمہ معلومات عامہ کے اخبار "کشمیر فورٹ نائٹلی[۹]" میں بھی شایع ہوئے۔

BAKHSHI GULAM ۲ BUDDHISM IN LADAKH AND KASHMIR ۱
CENSUS ۴ KHALID-KASHMIR ۳ MOHD. THROUGH MY EYES.
KASHMIR'S CONTRIBUTION ۶ HANDICRAFT ۵ REPORT.
SATIRE IN KASHMIRI ۸ POETICS ۷ TO SANSKRIT POETRY
- KASHMIR FORTNIGHTLY ۹ LITRATURE

ڈاکٹر کرن سنگھ، سابق صدر ریاست جموں و کشمیر و گورنر، جو اس وقت مرکزی حکومت کے سول ہوائی محکمہ کے وزیر ہیں، ماہر سیاست اور عالم ہیں۔ وہ ڈوگری کے اور انگریزی کے اچھے شاعر بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ[1] اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا منتخب مجموعہ[2] شائع ہو چکے ہیں۔ موخرالذکر مجموعے میں ان کے مضامین سفر نیپال، نیو کلچر چیلنج، سچائی کی فتح یونیورسٹیوں کے طلباء اور چینی چیلنج، اور کنیڈی کے انتقال پر اور تقریریں شامل ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنی ڈاکٹریٹ کے لئے آروبندو گھوش اور قومیت کے موضوع پر تحقیقات کی تھیں۔ چنانچہ ان کا مقالہ "دی پرافٹ آف نیشنلزم"[3] سنہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

بلراج پوری، جموں کے مشہور اہل سیاست ہیں، انہوں نے جموں اور کشمیر کی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر کتابچے شائع کئے ہیں۔ جن میں سے ایک کشمیر کی نزاع اور جموں[4] کے عنوان پر اور کشمیر میں کمیونزم[5]، کوآپریٹیو فارمنگ[6]، تفریح اور سماجی تعلیم[7] پر الگ الگ کتابچے شائع کئے ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "کشمیر افیرز"[8] بھی ہے۔

صاحب زادہ حسن شاہ، جو ریسرچ لائبریری سری نگر کے ناظم رہے اور کالجوں کی پرنسپلی کی خدمات بھی انجام دیں۔ محکمہ ریسرچ کے لئے تاریخ حسن کی تین جلدیں مرتب کرکے، انگریزی میں اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ انہیں شائع کیا تھا۔ کشمیر سیریز آف ٹیکسٹ اینڈ اسٹڈیز" بھی مرتب کرکے شائع کئے تھے۔ ایم۔ ایس۔ کولا نے محکمہ تحقیقات کی مطبوعات پر ایک تبصرہ شائع کیا تھا۔

۱۔ THE WAY OF THE SWAN ۲۔ SELECTED WRITINGS AND SPEECHS
۳۔ PROPHET OF NATIONALISM ۴۔ JAMMU-A CLUE TO KASHMIR
۵۔ COMMUNISM IN KASHMIR ۶۔ COOPERATION FORMING
۷۔ TANGLE ۸۔ RECREATION AND SOCIAL EDUCATION ۸۔ KASHMIR AFFAIRS

پنڈت ٹی۔ این۔ مدن، جو نسلیات[1] کے اچھے متعلم اور محقق ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے خاندانی رشتے[2] کے موضوع پر مقالہ مرتب کیا تھا۔

پروفیسر این۔ ایل۔ وزیر، ایس۔ پی۔ کالج میں عرصہ تک پروفیسر رہے، اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ان کو فن اور طریقہ تعلیم سے بھی دلچسپی رہی تھی۔ چنانچہ فن تعلیم[3] پر انہوں نے ایک کتابچہ مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

۱۔ ANTHROPOLOGY
۲۔ FAMILY KINSHIP
۳۔ TECHNIQUE OF TEACHING

کشمیری زبان اور ادب

کشمیری زبان جو وادی کشمیر کے علاوہ ، ملحقہ علاقوں ، رام بن کشتواڑ، پونچھ، گلاب گڈھ اور کچھ اور متصلہ مقامات میں بولی جاتی ہے۔ اپنی ایک مخصوص قواعد، صوتی نظام اور لفظی سرمایہ رکھتی ہے۔ کشمیری کے آغاز کے بارے میں دو نظریئے پیش کئے جاتے ہیں۔ کشمیر کے کچھ علماء اور باہر کے سنسکرت علماء اسے سنسکرتی گروہ کی زبان بتلاتے ہیں۔ اس کے لئے دو بنیادیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وادی کشمیر میں سنسکرت بہت قدیم زمانے سے رہی ہے اور یہاں اس زبان میں عرصۂ دراز تک علم وادب کے بلند پایہ کارنامے لکھے جاتے رہے ہے۔ دوسری بنیاد، بہت سے لفظوں کی سنسکرت الفاظ سے متجانس صورت ہے۔ اس کے مقابلے میں یورپ کے ماہرینِ لسانیات ہیں، جو کشمیری کو دردی گروہ کی زبان مانتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ٹرمپ اور شا قابلِ ذکر ہیں۔ ٹرمپ کشمیری کو دردی گروہ کی زبان تو مانتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دردی زبانوں کے الفاظ کی پشتو الفاظ سے مشابہت کی بنا پر، دردی زبانوں کو سنسکرتی گروہ میں شامل کرنے کی طرف مائل ہیں۔ اس کے برخلاف شا پامیر غلاچہ زبانوں کو سنسکرتی گروہ کی زبانیں تصور کرکے، کشمیری کی مشابہتوں کو، اپنے نظریہ کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔

گریرسن نے ان دونوں کے مغالطوں کو واضح کیا ہے اور اس کی وضاحت کی

ہے کہ پشتو اور غلاچہ دونوں مشرقی ایرانی گروہ کی زبانیں ہیں۔ اس طرح دردی زبانوں کی جو مشابہتیں، پشتو اور غلاچہ میں پائی جاتی ہیں، وہ دراصل انہیں ایرانی گروہ کی زبانیں ثابت کرتی ہیں۔ سنسکرت کے کشمیر میں رائج رہنے کی بنیاد پر، کشمیری کو سنسکرتی گروہ کی زبانوں میں شامل کرنے کے رجحان کو وہ یہ کہہ کر رد کردیتا ہے کہ کسی زبان کے کسی علاقے میں رائج رہنے کا یہ لازمی استنباط نہیں ہوسکتا کہ وہاں کی زبان، اُسی زبان سے نشوونما پائی ہے۔ اس کی مثال فارسی ہے، جو صدیوں تک، ہند اور کشمیر میں رائج رہی یا عربی جو ہسپانیہ میں مروج تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ہندوستان کی موجودہ زبانیں، فارسی سے متخرج زبانیں نہیں کہلا سکتیں۔ تو کشمیری کو سنسکرت سے کیوں مشتق کیا جائے؟ جہاں تک الفاظ کی مشابہتوں یا مستعار لینے کا تعلق ہے۔ گریرسن نے اُردو کی مثال پیش کی ہے۔ جس میں فارسی اور عربی لفظوں کی کافی تعداد ہے، لیکن وہ فارسی یا عربی کی مشتق زبان نہیں ہے۔

گریرسن نے اپنے نظریہ کی تائید میں مزید سند، لفظوں کی ترتیب کے نظام سے پیش کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ لفظوں کی جملوں میں ترتیب میں، کشمیری ہندوستان کی دوسری زبانوں سے مختلف ہے، جو سنسکرت سے مشتق مانی جاتی ہیں۔ ہند آریائی یا "اِندک" خود ہند ایرانی یا آریائی کی ایک شاخ ہے، اور یہ شاخیں بہت سی ہوسکتی ہیں۔ اور انہیں شاخوں میں سے ایک قدیم کشمیری بھی تھی۔ جس کا سنسکرت سے ہم ماخذ قدیم تر زبان کے الفاظ کا اپنا سرمایہ تھا۔ اور علمی اور ارضی تعلق کی وجہ سے نئے مستعار سنسکرت الفاظ کا کچھ ذخیرہ بھی اس میں داخل ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ اظہار کے کچھ انداز بھی سطح سے نیچے اتر کر زبان کی ساخت اور قاعدوں میں بھی داخل ہوگئے۔ اس سلسلے میں کشمیری کے بعض الفاظ میں، سنسکرت، س، ش کے مقابلے میں ایرانی خصوصیت "دد" کی ترجیح، کشمیری کو ایرانی سے قریب تر ثابت کرنے کے لئے پیش کی جاسکتی ہے۔

مثلاً سنسکرت بیس (سر) کشیری ہیر

" شُشر (خسر) " ہُہُر

" شت (صد) " ہُتھ

" سشک (سوکھا) " ہُوک وغیرہ

بعض علمانے کشیری کو مخلوط زبان بھی کہا ہے۔ ہند آریائی یا ہند ایرانی الفاظ کے کشیری میں مخصوص روپ کی توجیہ اس نقطہ نظر سے بھی کی گئی ہے۔ ایسے متعدد ماخذوں سے آئے ہوئے لفظ کشیری میں اس کے صوتی نظام کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

کشیری مصنفین میں سے بعض جیسے بامزئی، گریرسن کے نظریئے کو اس لئے قابلِ قبول نہیں سمجھتے کہ یہ عام عقیدے سے انحراف کرتا ہے۔ ان کا اس کے خلاف استدلال یہ ہے کہ چونکہ کشیری ابتداء میں برہمنوں کی زبان تھی، اس لئے اس کا ماخذ کشمیر میں رائج قدیم سنسکرت سے ہونا چاہیئے۔ اس کے مقابلے میں پریم ناتھ بزاز اس خیال کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں کہ کشیری دردی گروہ کے ان آریاؤں کی زبان ہے جو قدیم زمانے میں ہندوکش کے دامن میں آکر بس گئے تھے۔ اور یہ سنسکرت کے مقابلے میں ایرانی سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ بعض علماء کے بیانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کشمیری بول چال کی زبان کے طور پر اس زمانے میں بھی رائج تھی۔ جب سنسکرت علمی زبان تھی۔ اسلامی دور میں مسلمان حکمرانوں نے جس طرح ہندوستان میں نئی ہند آریائی زبانوں کو ترقی دینے میں مدد دی۔ کشمیر میں شہمیری سلاطین نے کشیری کی سرپرستی کی، سلطان شمس الدین کے عہد سے اُس کو ترقی ہونے لگی اور سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے تک وہ شعری تصورات کے اظہار کا ذریعہ بھی بننے لگی تھی۔ چنانچہ بڈشاہ کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ فارسی، کشیری اور ہندی تینوں زبانیں جانتا تھا۔ اس کی ایک کشیری نظم کا حوالہ بھی ملتا ہے جو اس نے محمود شاہ خلجی، حکمران مالوہ (۱۴۳۵ / ۱۴۶۸) کو

لکھی گئی تھی۔

بڈشاہ کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی وجہ سے کئی پنڈت علماء بھی جو سنسکرت کے عالم تھے کشمیری میں لکھنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں سوم پنڈت اور بودھ بٹ کی تصانیف "زینہ چرتر" اور "زینہ ولاس" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ بیان اس لئے مشتبہ ہے کہ یہ تصانیف اب دستیاب نہیں ہیں۔ سوم پنڈت کی "زینہ چرتر" کے بارے میں عبدالاحد آزاد مصنف "کشمیری زبان اور شاعری" کا خیال یہ ہے کہ یہ نثر میں لکھی گئی تھی۔ یہ بھی اشتباہ سے خالی نہیں کیونکہ ہماری زبانوں کی تاریخ میں نثر کا دور بعد کو آتا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ اس میں غالباً سنسکرت میں مروّج اوزان استعمال ہوتے تھے۔ حضرت شیخ نورالدین کے کشمیری کلام کی بناء پر، جو "شلوک" سے معلوم ہے۔ آزاد نے یہ رائے بھی قائم کی ہے کہ "نوینہ ولاس" سنسکرتی اوزان میں ہوگی۔ اور یہ کہ یہ تصانیف غالباً شاردا رسم خط میں لکھی گئی ہوگی، جسے کشمیری پنڈتوں نے گھروشٹی اور براہمی سے نشو ونما دیا تھا۔

آزاد کی مذکورہ بالا قیاس آرائی کے مقابلے میں بعض مصنفین نے شتی کانتھ کی "مہانئے پرکاش" کو کشمیری کی اولین تصنیف بتایا ہے۔ جس میں شیومت کے عقائد کی تفصیل اور فلسفہ بیان کیا گیا تھا۔ اس کی زبان قدیم اور سنسکرت سے لدی ہوئی مانی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک دستیاب ادب کا تعلق ہے۔ للہ دید کے واکھ اب ہماری دسترس میں ہیں۔ گو ان میں بھی بعض محققین کا خیال ہے کہ حضرت نورالدین ریشی کا کلام بھی خلط ملط ہوگیا ہے۔ "واکھ" بھی سنسکرت روایت کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ "واکھ" "واکیہ" یا "واک" جملہ یا بات کے معنی میں سخن اور کلام کے مترادف ہے۔ اسی روایت کی پابندی حضرت نورالدین ریشی کے کلام میں بھی ملتی ہے، جو "شلوک" یا "شرووا" کے علاوہ "واکھ" سے بھی موسوم ہے۔

للہ دید، للہ عارفہ اور للہ ایشوری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وہ اپنے عارفانہ کلام اور کشمیری ادب میں اپنے تاریخی موقف کے باعث ایک احترام کا مقام رکھتی ہیں۔ للہ دید کی ولادت کا سنہ ۷۰۰ اور ۷۳۵ کے درمیان متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا خاندان آسودہ حال تھا۔ تعلیم و تربیت کے بعد للہ کی شادی ایک برہمن زادے سے ہوئی تھی۔ لیکن ساس کی سخت گیریوں کی وجہ سے وہ دنیا سے دل برداشتہ ہو گئیں۔ اور ایشور سے لو لگا کر، گیان دھیان میں غرق ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک ہندو فقیر باسد یو کی مُرید تھیں۔ گرو کی تعلیم نے ان میں عرفان اور عشق حقیقی کا ذوق پیدا کر دیا اور وہ اکثر محویت کے عالم میں رہا کرتی تھیں۔ اس حالت میں ان کی زبان پر عارفانہ کلام جاری ہو جاتا تھا۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی اس زمانے میں کشمیر تشریف لائے اور بتایا جاتا ہے کہ للہ دید کی ملاقات حضرت امیرؒ سے ہوئی تھی۔

للہ دید کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان صوفیوں اور زاہدوں کی مجلسوں میں بھی جاتی تھیں اور ان سے بھی روحانی فیضان حاصل کیا تھا۔ سید جلال الدین بخاری کے مزار پر وہ اکثر جایا کرتی تھیں اور سید حسین سمنانی سے بھی روحانی فیض حاصل کیا تھا۔ کشمیری میں للہ دید کے واکھیہ مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت کے بھی کچھ شلوک ان سے منسوب ہیں۔ للہ دید کے واکھیوں کی زبان قدیم اور موجودہ کشمیری سے مختلف ہے۔ گریرسن نے للہ دید کے کلام کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ پروفیسر جیا لال کول، جنہوں نے پروفیسر نند لال کول طالب کے تعاون سے، للہ دید پر اُردو میں ایک رسالہ مرتب کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"للہ دید کا کلام مستی و سرشاری کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں معرفت کے رموز و اسرار کا وہ خزانہ موجود ہے جو سنتوں اور صوفیائے کرام کے ریاض اور عمل کے حسین امتزاج پر مشتمل ہے اور جو ان کی باہمی نقطۂ

اور مماثلت کا آئینہ دار ہے۔"

پروفیسر نندلال طالب نے للہ دید کے واکھیہ کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دو ایک واکھیہ ذیل میں درج ہیں۔

آئی ہوں کس دیس سے کس راہ سے ‏ ‏ ‏ جاؤں گی کس دیس کو حیراں ہوں

راستے کی کب مجھے پہچان ہو

کس قدر خوش بخت میں ہوتی، اگر ‏ ‏ ‏ آگہی اس راز سے ہوتی مجھے

بے حقیقت ہے یہ نفس بے اعتبار

مرشد سے بات پوچھی یہ میں نے ہزار بار ‏ ‏ ‏ جس کا بیاں محال ہے اس کا ہے نام کیا

میں تھک گئی ملا نہ مگر آج تک جواب ‏ ‏ ‏ کچھ ہے جو سب کی اصل ہے، اس میں کلام کیا

حضرتِ نورالدین جو نورالدین ریشی اور نند ریشی کے نام سے بھی موسوم ہیں۔ زہد و ریاضت کی بدولت اپنے زمانے کے سربرآوردہ ولی ہوئے ہیں۔ کشمیری میں متصوفانہ شاعری کو فروغ دینے میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ آپ ۱۳۷۷ء میں موضع کیموہ میں پیدا ہوئے تھے۔ روایت ہے کہ ولادت کے بعد تین دِن تک آپ نے ماں کی چھاتی سے دودھ نہیں پیا۔ چوتھے دِن للہ عارفہ آئیں اور اپنے ہاتھ کی دو اُنگلیاں آپ کے منہ میں دے دیں، جن سے دودھ آنے لگا۔ حضرتِ نورالدین کا سلسلۂ نسب[۱] حضرت اویس قرنی تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ کے بارے میں سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ کشتواڑ کے راجہ تھے۔ راجہ کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹے کشمیر آئے اور ایک بھائی نے تحصیل کولگام کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے والد سالار دین بڑے متقی بزرگ تھے۔ زمانۂ طفلی ہی سے شیخ سے غیر معمولی عادات و اطوار ظاہر

[۱] حضرت شیخ کا روحانی سلسلہ نسب اویس قرنی تک پہونچتا ہے۔ لیکن سروری صاحب نے جس انداز سے لکھا ہے۔ [illegible] اللہ ابو[illegible]

ہوئیں۔ آپ کیموہ کے غار میں مدتوں گوشہ نشین رہے۔ بعد میں آپ نے خاندانی بندھنوں کو ترک کر کے اپنی ریاضت وعبادت کا لمبا سلسلہ شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی وادیٔ کشمیر کے اکثر مقامات کی سیر کی۔ آپ نے عوام کی زندگی کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ آخر آپ دری گام اور رو پیون کے گاؤں میں اپنا سجادہ لگا کر بیٹھ گئے اور اس طرح سے کشمیر کے مشہور ریشی مسلک کی بنیاد ڈالی۔ آپ کے شاگردوں میں حضرت بابا بام الدین، حضرت بابا زین الدین اور دوسرے اعلیٰ پایے کے ریشی گذرے ہیں۔ ریشی مسلک میں کشمیر کی قدیم تہذیب اور اسلام کے نئے اصولوں کے ریشمی دھاگے ایک دوسرے سے اس طرح گتھ گئے کہ ایک بے نظیر روحانی سلسلے کا گلدستہ تیار ہو گیا۔ ریشی مسلک میں صلۂ رحم، خدا ترسی، انسان دوستی اور رواداری کے عناصر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ رزقِ حلال کے علاوہ خدمتِ خلق پر بھی بے حد زور دیتے رہے۔ انہوں نے سبزیوں، ترکاریوں کو اپنی خوراک بنایا، اور ثمر یار درختوں کی تنصیب اور آبیاری کرتے رہے۔ یہ تمام سنہری اصول حضرت شیخ نور الدینؒ کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے براہِ راست مشتق اور ماخوذ ہیں۔

حضرت شیخ نورالدین عوامی زندگی کے بہت قریب تھے اور انہوں نے عوامی محاورے کو اپنی شاعری کا ذریعہ اظہار بھی بنایا۔ لل عارفہ اُن سے کچھ ہی عرصہ قبل گذری تھیں۔ شیخ نورالدین کا شروک، اشلوک، لل عارفہ کے واکھیہ سے صرف ہیئت میں ہی نہیں بلکہ خیالات وافکار میں بھی ملتا جلتا ہے۔ لیکن جہاں لل عارفہ کے کلام میں ایک فلسفیانہ عُمق اور فنکارانہ نزاکت ملتی ہے، وہاں شیخ نورالدین کے کلام میں ایک تبلیغی لب ولہجہ اور ایک عوامی مزاج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لل دید کے کلام پر کشمیر کے روایتی شیو فلسفے کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ لیکن شیخ نورالدین کے یہاں اسلامی افکار کے سُر تیز ہو جاتے ہیں۔ وہ قرآنِ مجید سے بے حد متاثر تھے اور اس کا اثر اُن کے کشمیری کلام پر اتنا گہرا ہے کہ بعض اوقات اسے "کشمیری قرآن" کہہ کر بھی یاد کیا

جاتا ہے۔ حضرت شیخ کے کلام میں فقہ اور اسلامی عبادات و ریاضات کے بہت سے مسائل بھی بیان ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان پر سنسکرت کا کافی اثر ہے۔ لیکن اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ اس لئے قدیم کشمیری میں حضرت شیخ کا کلام موجودہ بول چال کی کشمیری زبان سے سب سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کا معیاری رنگ یوں ہے۔

"ملاؤں کے کلاہ کی کلغیاں کیا زیب دے رہی ہیں اور وہ کس ناز و انداز سے ٹھمک ٹھمک کے چلتے ہیں۔ پاؤں میں زری جوتے پہنے ہوئے اور جسم پر قبا و عبا سجائے ہوئے۔ لیکن ان کی آستینوں میں بھیک کے لئے بڑے بڑے کاسۂ گدائی بھی ملیں گے۔"

"وہ میرے پاس ہے اور میں اُسی میں محو۔ مجھے اُسی کے وصل میں قرار نصیب ہوا۔ میں اُسے بس خواہ مخواہ پرائے دیشوں میں ڈھونڈھتا رہا۔ میرا یار تو مجھے اپنے ہی دیش میں مل گیا۔"

حضرت شیخ نے ۱۴۳۸ء میں روپہ وَن میں وفات پائی۔ ان کے جسد کو چرار شریف لاکر آسودہ کیا گیا۔ جہاں یہ مرجع خاص و عام رہتا آیا ہے۔ اس بقعۂ عالیہ پر بادشاہ بھی آتے رہے ہیں اور عام کسان و دہقان بھی۔ اہلِ ہنود بھی چرار جاکر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کشمیریوں کی قومی زیارت گاہ بن گیا ہے۔

حضرت شیخ نورالدین زین العابدین بڈشاہ کے دور میں گذرے۔ یہ دور کشمیری تمدن کے احیاء کا ہی نہیں استحکام کا دور بھی تھا۔ اس دور میں کشمیری زبان میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جو امتدادِ زمانہ معدوم ہوگئی ہیں۔ شاہمیریوں کے بعد چک دور آیا۔ اس دور میں اگرچہ کشمیر میں سیاسی افراتفری رہی لیکن کشمیری زبان کی طرف توجہ دی جاتی رہی۔ چک عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھے اور اسی لئے اُن کے زمانے میں کشمیری مرثیے کو ایک مضبوط اور مربوط اساس مل گئی۔

حال ہی میں بہت سے محققین نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے چک دور میں مرتب کئے ہوئے کشمیری مرثیے دریافت کئے ہیں۔ جو اپنے مزاج، مفہوم اور آہنگ کے لحاظ سے کشمیری ثقافت کی کچھ عجیب جہتوں کا سُراغ دیتے ہیں۔

آخری چک بادشاہ یوسف شاہ کے دور میں کشمیری ادب و ثقافت کے آسمان پر ایک ایسا چاند طلوع ہوا۔ جس کی کرنیں کشمیر سے باہر بھی اُجالا کرتی ہیں۔ یوسف شاہ چک سنہ ۱۵۸۱ء سے سنہ ۱۵۸۶ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ اور بعد میں مغل بادشاہ اکبر اعظم نے اُسے جہانسہ دیکر دہلی بلا لیا۔ وہاں یوسف شاہ کو جلاوطن کر دیا اور کشمیر باقاعدہ طور مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ یوسف شاہ خود ایک معارف پرور اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اُس کا یہ فارسی شعر تذکروں میں نقل ہوتا رہا ہے اور اُس کی شاعرانہ افتاد کا پتہ دیتا ہے۔

در آرزوئے آں بُتِ کشمیر نہادے
شُد تارسر و مار از گریہ دو چشمیم

(تارسر اور مارسر کشمیر کی مشرقی پہاڑیوں میں واقع دو خوبصورت چشموں کے نام ہیں)

حبہ خاتون ایک کسان کی بیٹی تھی۔ لیکن اُس کی فطرت میں شعر اور نغمے کا ذوق ازل سے ہی ودیعت تھا۔ چنانچہ جب وہ پانپور کے نزدیک زعفران کے کھیتوں میں ایک نغمہ گا رہی تھی جس کے بول یوں نقل ہوئے ہیں۔

دُاری دِہِن مستی واڑ چھس نو۔ چار کر میُون مالِنیو ہو

میں سسرال والوں کے ساتھ خوش نہیں ہوں۔ ارے او میرے میکے والو! اِسکا چارہ تو کرو!

تو یوسف شاہ چک کا وہاں سے گذر ہوا۔ وہ اِس شیریں آواز اور ان رسیلے بولوں سے متعجب ہوا کہ اِس ماہ پارہ پر جسکا اصل نام "زوُن" یعنی چاند تھا، دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ انہا نے شادی کا پیغام زون کے باپ عبدی راتھر کو بھیجا۔ وہ شہزادے کے پیغام سے پھولا نہ سمایا اور اِس طرح سے کھیتوں کی رانی قصرِ سلطانی کی ملکہ بن بیٹھی۔ محل میں پہونچ کر حبہ خاتون جو

یوسف شاہ نے اس کا خطاب رکھا تھا، کے جوہر اور بھی چمک اُٹھے۔ اس نے کشمیر کی صوفیانہ موسیقی کو مرتب و منضبط کیا۔ اِس کے استادوں اور اِس کے گایئن کی سرپرستی کی۔ خود ایک مقام راستِ کشمیری کا اختراع کیا اور اپنے پاکیزہ مذاق شوہر کے ساتھ دادِ عیش دیتی رہی۔ لیکن بعد میں اکبر بادشاہ کے حملے نے یہ بساط الٹ دی اور ملکہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ملکہ کا جو مختصر سا کلام امتدادِ زمانہ سے بچ کر محفوظ رہ گیا ہے، اُس میں حُزن اور یاس کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اس کے کلام میں ہلکے پُھلکے رُومانی جذبات ملتے ہیں۔ لیکن اُس کے بیان میں بڑے شوخ رنگ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً "

میں نے تمہارے لئے چنبیلی کے دستانے تیار کر لئے۔

آ اور میرے انار کے پھولوں سے لُطف اُٹھا۔

میں زمین ہوں اور تم آسمان۔

میں راز ہوں تو تم اُس کے سرپوش۔

میں خوانِ نعمت ہوں تو تم اس سے لطف اندوز ہونے والے مہمان"

حبہ خاتون کے رومانی نام کے اِرد گرد اسطور و افسانے کا ایک بڑا قصر تعمیر ہوا ہے اور اب یہ نام ہندوستان کے ادب میں بھی جانا پہچانا بن گیا ہے۔

مغل دور کشمیر میں علوم و فنون کی ترویج و ترقی کا زمانہ تھا۔ لیکن اُس وقت عجم کی زبان اور اسالیب کا سیلاب کشمیر میں در آیا۔ فارسی ایک ترقی یافتہ زبان تھی۔ اور اصفہان سے لے کر دکن تک اس کا دور دورہ تھا۔ اسمیں بڑے عظیم شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب یہ مغل حشم و علم کے سائے میں کشمیر پہونچی تو یہاں کی نظر کو خیرہ کر گئی۔ کشمیری ادب کے چراغ میں حبہ خاتون نے روغن ڈالا تھا۔ لیکن فارسی کے فانوس کے آگے اُس کی مدھم روشنی ماند پڑ گئی۔ چنانچہ عہد مغلیہ میں جہاں کشمیر نے فارسی علم و ادب میں حضرت شیخ یعقوب صرفی رح، ملا محسن فانی اور مُلا طاہر غنی جیسے مشاہیر پیدا کئے، وہاں کشمیری ادب کی طرف بہت کم توجہ ہوئی۔ لیکن مغل دور کے خاتمے کے بعد کشمیری زبان و ادب میں ایک ہی حرارت پیدا ہوئی۔ اسی دوران ارنہ مال ایک صاعقے کی طرح چمکی اور

چشم زدن کے لئے ہی سہی، کشمیری شاعری کے منظر کو چمکا گئی۔ ارنہ مال فارسی کے مشہور شاعر اور افغان دور کے درباری منشی بھوانی داس کاچرو کی بیوی تھیں۔ اُن کے کلام میں انار کے شگوفوں جیسا شوخ رنگ چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

افغانوں کے دور کے آخر میں ہی پرکاش رام کرُیگامی اور محمود گامی منصۂ شہود پر آئے۔ پرکاش رام نے رامائن کا کشمیری روپ نظم کیا (یہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس ہندوستان گیر کلاسیک کا ایک مقامی VARIEATION ہے۔ محمود گامی نے خمسۂ نظامی کے قصوں، یوسف زلیخا، شیریں خسرو، شیخ صنعان وغیرہ کو کشمیری میں ڈھالا۔ اور مثنوی کی صنف کو کشمیری میں رواج دیا۔ اُس نے ہلکے پھلکے گیتوں کی صنف "وژن" کو بھی خوب مالامال کیا اور فارسی بحروں پر غزلیں بھی لکھیں۔ اس لحاظ سے اُسکو کشمیری زبان کے جدید دور کا رودکی کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے۔ اُسی کی ایک مثنوی "یوسف زلیخا" کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اسے جرمنی کے ایک مستشرق برکھرڈ نے گذشتہ صدی میں اپنی زبان میں منتقل کر لیا۔ محمود گامی کا ذکر دوسرے یورپی کشمیر شناسوں نے بھی کیا ہے۔

سکھوں کے دور میں کشمیری زبان میں ولی اللہ متو اور اسی قبیل کے دوسرے شاعر منظرِ عام پر آگئے۔ ولی اللہ نے کشمیری لوک کہانی "ھیمال" کو کشمیری زبان میں نظم کیا اور حضرت امیر کبیر شاہ ہمدان کی "چہل اسرار" کا کشمیری ترجمہ کیا۔ ڈوگروں کے ابتدائی دور میں رسول میر، مقبول کرالہ واری، سوامی پرمانند، دہاب کھار جیسے شاعر منصۂ شہود پر آئے۔

رسول میر ڈورو کے رہنے والے تھے اور انہیں کشمیری زبان کے شاعرِ شباب کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک روایت شکن اور جدت طراز شاعر تھے۔ اس کے کلام میں کشمیری شاعری کی روائت کے برعکس تیز و تند عاشقانہ جذبات کا بڑے بے باک انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس کا لب و لہجہ بھی کلاسیکی پختگی اور اُستادانہ رچاؤ رکھتا ہے۔ اُس کی زبان پر بھی فارسی کے اساتذہ کے اسلوب کی پرچھائیں عکس انداز نظر آتی ہیں۔ چند اشعار کا انداز یہ ہے۔

"اے میرے دل بند، دل آزار اور دل آرام محبوب
میرے خوش خندہ، خوش گفتار اور خوش اندام محبوب
سیتا نے جوشِ محبت میں اپنے من میت کے پروانہ وار طواف کئے
اس نے کیسے رسیلے گیت گا گا کر اپنے محبوب کو رام کر لیا"

"اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لے نہیں تو میں کچھ کھا کے سو رہوں گا
چاہے گناہ ہو یا ثواب جامِ جمشید سے شراب پلا دے"

مقبول کرالہ واری کشمیری زبان کے بسیار لیکن نغز گو شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اُس نے بہت سے مقامی موضوعات پر خالص کشمیری محاورے اور عام بول چال کی colloquial زبان میں مثنویاں لکھنے کا جرأت انگیز تجربہ کیا۔ اس کی "گرہستی نامہ" اور "پیر نامہ" اس صنف کی اچھی مثالیں ہیں۔ اس کا قلم ان تصنیفات میں طنز و طعن کے انگارے برساتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن "بہار نامہ" میں اسی قلم سے شگوفے کھلتے ہیں۔ اُس نے کشمیری میں غزلوں اور گیتوں کا بڑا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے۔ جسے بعد میں عبدالاحد آزاد مرحوم نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ لیکن اس کی سب سے اہم تصنیف "گل ریز" ہے۔ یہ ضیا نخشبی کی اسی نام کی مثنوی کا کشمیری پیراہن ہے۔ لیکن جہاں اصل ایک گمنام ورق بن گئی ہے۔ وہاں مقبول کی گلریز ایک شاداب و شاندار کارنامے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اُس نے کہانی کا تار و پود اگرچہ نخشبی سے لیا۔ لیکن اسے اپنے مرقعوں سے زندہ جاوید بنا ڈالا۔ اُس کے زورِ قلم کا اندازہ لگانا ہو۔ تو اس مثنوی کے اُن مقامات کو دیکھنا چاہیئے جہاں اس نے مثنوی کی نائیکہ نوش لب کا سراپا، اُسکی مثنوی کے نائیک عجب ملک سے ملاقات اور جدائی اور پھر باغ و راغ کے مناظر قلم بند کئے ہیں۔ اس مثنوی کو ریاستی کلچرل اکادمی نے محمد یوسف ٹینگ کے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ بڑے حسین و جمیل پیرائے میں شائع کیا ہے۔ غلام رسول سنتوش نے اس کو تصویر کے رنگوں سے بھی مزین کیا ہے۔

سوامی پرمانند کشمیری شاعری کے دوسرے چند اہم شاعروں کی طرح پٹواری تھے۔ اُن کے کلام پر سنسکرت کلاسیک کا بڑا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اور اس کی لفظیات پر بھی دھارمک کتھاؤں کی چھاپ ملتی ہے۔ اُس نے سُدام چرت لکھی اور اس کے علاوہ بہت سے گیت اور لیلائیں بھی۔ اُس کا کُلیات کلچرل اکادمی کی طرف سے دو جلدوں میں شائع کیا جا چکا ہے اور اپنے تفکر آمیز عُمق اور ژرف بیانی کے لئے خاص قدر و قیمت کا حامل ہے۔

کشمیری زبان میں تصوف کی ابتدائی لہر اگرچہ لل عارفہ اور شیخ نورالدین کے زمانے میں ہی موج زن نظر آتی ہے، لیکن وہاب کھار، نعمہ صاحب، سوچھ کرال، شاہ غفور، رحمٰن ڈار، شمس فقیر اور دوسرے شعرائے کے یہاں اس کی گہرائی اور نیاکاری میں بہت اضافہ ہوا۔ ان شاعروں کے کلام میں ایک ایسی سرمستی چھائی ہوئی نظر آتی ہے جس پر دل کی دنیا کے مناظر کا دریچہ کھلتا ہے۔ یہ روایت جس پر ویدانت اور اسلامی تصوف دونوں کا اثر ہے، جواں ہوتے ہوتے ہم عصر شعرا، صمد میر (جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے) اور احد زرگر تک پہونچتی ہے جو اس روایت کے نہایت ہی اعلیٰ مرتبت علمبردار اور نغمہ خوان ہیں۔ کشمیری زبان میں رزمیہ اور تواریخی نظمیں لکھنے کا سلسلہ امیر شاہ کریری اور وہاب [illegible] نے شروع کیا۔ ایک نے "سام نامہ" کشمیری میں ڈھالا اور دوسرے نے فردوس کا [illegible]۔ اس کے علاوہ غزویات آنحضرتؐ بھی کشمیری میں نظم کئے۔ محی الدین مسکین نے زیبا رنگار جیسی عجمی داستان کشمیری میں نظم کی۔ اس صنف میں عزیز اللہ حقانی اور لسہ خان وغیرہ کے کارنامے بھی قابلِ ذکر ہیں۔

اس صدی کی تیسری دہائی میں پیرزادہ غلام احمد مہجور نے کشمیری نظم کی کایا پلٹ ڈالی۔ مہجور ایک شجرہ کش تھے اور اردو و فارسی زبانوں پر صرف گہری نظر ہی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اہلِ زبان داد سخن بھی دیتے تھے۔ انہیں کشمیری کی کلاسکی روایت کا بھی عرفان تھا اور کشمیر کے شاندار ماضی کا بھی۔ وہ لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے ان جلسوں میں بھی شامل رہنے، جن میں علامہ اقبالؒ "شکوہ" جیسی روایت شکن نظمیں سُنایا کرتے تھے۔ مہجور پر ان تمام عوامل نے اثر کیا اور انہوں نے

کشمیری زبان میں شاعری شروع کردی۔ اُن کی شاعری پر رسوا، میر کی غنائیت کا پرتو بھی تھا اور حبہ خاتون کے رسیلے پن کا سایہ بھی۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کے افکار بھی بڑے حسین پیرایے میں اِدھر تاک جھانک کرتے رہے۔ انھوں نے ایک نئے لہجے کے ساتھ اپنی نظم "باغِ نشاط کے گُلو" لکھی۔ جو کشمیری شاعری کا ایک سنگِ میل ثابت ہوگئی اور فوراً زبانوں پر چڑھ گئی۔ یہی زمانہ کشمیر میں سیاسی تحریک کے ابھار اور جوبن پر آنے کا تھا۔ مہجور نے اُس کی سنگت بھی کی۔ اور وہ کشمیریوں کے قومی شاعر بن گئے۔ اُن کی مشہور نظم "وُلو ہا باغوانو نَو بہارُک شان پیدا کر" (اے باغوان۔ ذرا نئی بہار کی آن بان پیدا کر) لکھی۔ جسے تحریک کے سب سے بڑے قائد شیخ محمد عبداللہ نے علامہ اقبال کی انقلاب انگیز نظموں کے دوش بدوش عظیم عوامی اجتماعات میں گایا اور لوگوں کے دِل گرما دیئے۔

مہجور کے گیتوں میں حب وطن کے ساتھ فنی تازہ کاری اور فکر کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ اور اس نے کشمیری زبان میں اظہار کے لئے سانچے اور نئے اسالیب پروان پڑھانے کے لئے زمین ہموار کی۔ مہجور کے گیتوں کا ترجمہ جب انگریزی زبان میں ہوا تو رابندر ناتھ ٹیگور نے اُن کی داد دی۔ مہجور ۱۹۵۲ء میں انتقال کرگئے۔ اور پہلے کشمیری شاعر بنے جنہیں سرکاری اعزاز و اکرام کے ساتھ سری نگر کے نزدیک مزارِ شعراء میں دفن کیا گیا۔ وہ کشمیری زبان کے پہلے شاعر ہیں جن کی زندگی پر "شاعرِ کشمیر" مہجور کے نام سے اردو اور کشمیری میں فلمیں بنائی جاچکی ہیں۔

مہجور کے ایک اور ہم عصر عبدالاحد آزاد مرحوم نے اگرچہ اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز مہجور کے دیو قامت ادبی وجود کے سائے میں ہی کیا۔ لیکن انھوں نے مارکسی خیالات کی زیادہ کھل کر اور صراحت کے ساتھ ترجمانی کی۔ وہ کشمیر کے مشہور صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز کے حلقۂ اثر میں تھے۔ جو ایم۔ این۔ رائے کے ریڈیکل ہیومنسٹ نظریے کے حامی ہیں۔ چنانچہ اُن کے زیرِ اثر آزاد نے نہائت آزاد خیالی سے معاملات پر خامہ فرسائی کی۔ اگرچہ ان کی بلند آہنگ نظم میں کبھی کبھی شعری مزاج کی نفاست دوسرا درجہ اہمیت کرلیتی ہے۔ مگر اُن کے موضوعات کا تنوع اور نظریات کا پھیلاؤ اسقدر رہے

کہ اس نے کشمیری زبان کا دامن وسعت پذیر کرنے کے لئے تاریخی خدمت انجام دی ہے۔ آزاد ایک دیدہ ور محقق اور نکتہ شناس ناقد بھی تھے۔ اُن کی کشمیری زبان اور شاعری "شاعروں کا پہلا مستند تذکرہ ہے اور اس کی بدولت گمنام کشمیری شعراء اس زبان کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔

مہجور اور آزاد کے معاصرین میں ماسٹر زندہ کول، حیرت کاملی پاندانی، نندلال امبار دار، اور غلام احمد فاضل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں کشمیر کی آزادی کے ساتھ ہی کشمیری زبان کی ساری کائنات بھی زلزلہ آشنا ہو گئی۔ کشمیر پر حملے کے عواقب اور ترقی پسند تحریک کے اثرات کے نتیجے میں یہاں اظہار کی ایک طوفانی لہر پیدا ہو گئی۔ اس لہر کی چوٹی پر دینا ناتھ نادم، مرزا عارف اور عبدالستار عاصی وغیرہ نظر آرہے تھے۔ دینا ناتھ نادم نے کشمیری میں نظم معرا کا آغاز کیا۔ اُن کی لفظیات کا عجائب خانہ اسقدر نرالا تھا کہ کشمیری زبان کے خوابیدہ امکانات رنگینیاں لینے لگے اس کے علاوہ اُن کا لب و لہجہ اسقدر تنومند تھا کہ کشمیری نظم میں ایک نئی گھن گرج اور گونج پیدا ہو گئی۔ مرزا عارف کی نظمیں اگرچہ پختہ سانچوں میں ہی ڈھلیں۔ لیکن برتاؤ اور مضامین کے لئے لحاظ سے وہ نئے دور کی نقیب تھیں۔ عبدالستار عاصی خود ایک جفاکش مزدور تھے اس لئے احسان بن دانش کی طرح اُن کی نظموں میں محنت کی حرمت و اخلاص کی تصویر کشی ملتی ہے۔

اس قافلے کے ساتھ ہی رحمٰن راہی، نور محمد روشن، غلام نبی فراق، امین کامل جیسے شعراء بھی سامنے آگئے۔ انہوں نے اگرچہ ترقی پسند تحریک کے شعلے سے ہی اپنے چراغ جلائے لیکن بہت جلد ہر ایک نے اپنا اپنا رنگ پیدا کر لیا۔ رحمٰن راہی انگریزی، فارسی اور اُردو کے بہت ہی نکتہ ور قاری ہیں۔ ان کی نگارشات کا گراف ہر لحظ اوپر کو اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری میں لہجے کی لطافت اور نفاست کے ساتھ ساتھ ہیئت کی مرصع کاری بھی نظر آتی ہے۔ راہی کو ان کے پہلے مجموعۂ کلام "نوروز صبا" پر ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔ وہ بعد میں ترقی پسند تحریک سے برگشتہ ہو کر جدید حیثیت کے مکتب کے نزدیک تر آگئے ہیں اور کشمیری میں اُنکا کلام اس مکتب

کی علمبرداری بھی کرتا ہے اور اسکی تفسیر و تعبیر بھی

امین کامل بھی ساہتیہ اکادمی کا انعام حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کی غزلیات کو کشمیری زبان کے ناقدوں نے ایک نئے لب و لہجہ کا حامل بتا دیا ہے اور کشمیری نظم میں بھی انہوں نے بڑے دلفریب تجربات کئے ہیں۔

غلام نبی فراق کا کوئی شعری مجموعہ اگرچہ شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

کشمیری شاعری کے لئے غلام رسول سنتوش کے علاوہ ماسٹر زندہ کول اور مرغوب بانہالی بھی ساہتیہ اکادمی کا اوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ مظفر عازم، غلام نبی خیال، میر غلام رسول نازکی، رشید نازکی، مشعل سلطانپوری، غلام نبی ناظر، ناجی منور، غلام احمد گاش، محی الدین گوھر، موتی لال ساز، غلام نبی آتش، محمد ایوب بے تاب، سجود سیلانی، رفیق راز اور دوسرے بہت سے شعراء اپنے کلام سے کشمیری زبان کی مختلف اصناف کو مالامال کر رہے ہیں۔ مرحوم رسا جاودانی نے اگرچہ کم لکھا ہے، لیکن ان کی غزلیات کا رچاؤ اور کلاسکی مزاج انہیں اس زبان کی تاریخ میں اپنا مقام دلانے کے لئے کافی ہے۔

نثر

کشمیری زبان میں اس صدی کی پہلی چوتھائی تک کسی قابل لحاظ نثر کا وجود ہی نہیں تھا۔ پھر پارسی تھیٹر کے زیر اثر کچھ کشمیری ڈرامے "راجہ ہریش چندر" وغیرہ لکھے گئے۔ محی الدین حاجنی نے اپنا پہلا ڈرامہ "گریسی سندگر" اس صدی کی چوتھائی دہائی کے نصف آخر میں لکھ کر ایک نئی روائیت کی بنیاد ڈالی۔ اسی زمانے میں سری پرتاپ کالج سری نگر کے جریدے "پرتاپ میگزین" کا کشمیری سیکشن پہلے غلام نبی گلکار انور اور پھر سری کنٹھ توشخانی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ جس میں کشمیری نثر پارے بھی شامل ہوتے تھے۔ مہجور صاحب کے فرزند محمد امین ابن مہجور نے بھی اس زمانے کے آس پاس کشمیری زبان کا پہلا اخبار "گاش" نکالا جو اگرچہ جلدی بند ہو گیا۔ لیکن

اُس سے کشمیری زبان کے نئے امکانات کی نشاندہی ہوگئی۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں قومی کلچرل محاذ کی تشکیل کے ساتھ ہی کشمیری کے ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔ اِسی زمانے میں کشمیری زبان کا پہلا باقاعدہ ادبی میگزین "کونگ پوش" شایع ہونا شروع ہوا۔ اِس میں دینا ناتھ نادم نے کشمیری زبان کی پہلی کہانی "جوابی کارڈ" لکھ کر شائع کی۔ اسی دوران سوم ناتھ زتشی، حبیب کامران، عزیز ہاروں وغیرہ نے بھی نثر میں تجربے کئے۔ کشمیری کہانیوں کا پہلا مجموعہ اختر محی الدین نے ست سنگر کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شایع کیا۔ اختر نے کشمیری موضوعات پر ایک نئے انداز کے ساتھ لکھا تھا اور اُس کی نثر برجستہ اور روزمرہ کے قریب تھی۔ اِس لئے جلد ہی اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ اُسے ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا۔ اختر کے کئی اور نثری مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور انہوں نے ریڈیو کے لئے کچھ ایکانکی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے کشمیری زبان کا پہلا ناول "دود دگ" بھی لکھا۔ امین کامل نے بھی کشمیری کہانیاں لکھیں اور ایک ناول "گٹہِ منز گاش"۔ علی محمد لون نے اگرچہ کہانیاں بھی لکھیں اور ناول بھی لیکن انہیں اُن کے ڈراموں کی نسبت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ ان کو "سُیہ" نامی ڈرامے پر ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا ہے۔ اور انہوں نے ریڈیو کے لئے بھی درجنوں چھوٹے بڑے ڈرامے لکھے ہیں۔ پشکر بھان کے مزاحیہ ڈراموں کے مجموعے "مچامہ" کو بھی ساہتیہ اکادمی کا اوارڈ ملا ہے۔ اوتار کشن رہبر، ڈاکٹر شنکر رینہ، امیش کول، ہردے کول بھارتی، تاج بیگم رینزو وغیرہ نے بھی فکشن کی مختلف اصناف میں تجربے کئے ہیں

تنقید اور تحقیق کے میدان میں بھی کشمیری زبان تیزی سے قدم بڑھا رہی ہے۔ اِس سلسلے میں ان خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جو کلچرل اکادمی اور اِس کے کشمیری رسالے "شیرازہ" نے انجام دی ہیں۔ اِس نے کشمیری تحقیق و تنقید کے موضوع پر متعدد کتابیں شایع کی ہیں۔ اور "شیرازہ" میں مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر بڑے اہم تنقیدی اور تجزیاتی مضامین شایع ہوئے ہیں۔

کشمیری زبان میں صحافت کے تجربے بھی برابر کئے جارہے ہیں۔ غلام نبی خیال نے

وطن ثانی ہفتہ وار نکالا اور کشمیر کلچرل آرگنائیزیشن نے "کوشر اخبار"۔ لیکن ابھی تک ایک روزانہ اخبار نکالنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ کشمیری رسم الخط جو اُردو رسم الخط سے بہت قریب ہے آہستہ آہستہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ کشمیری زبان میں قرآن مجید کا ایک ترجمہ شائع ہوا ہے، جو میر واعظ کشمیر مولوی یوسف شاہ مرحوم نے کیا ہے۔ کلچرل اکادمی اور ساہتیہ اکادمی نے دنیا کے اَدب العالیہ کے کچھ شاہ پاروں کو کشمیری میں منتقل کر کے کشمیری زبان کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔

ڈوگری زبان و ادب

ریاست جموں و کشمیر کا دوسرا لسانی خطہ جموں اور اس کے ملحقہ اضلاع پونچھ، ڈوڈہ، بھدرواہ، پر مشتمل ہے۔ جہاں ڈوگری زبان، اور اس کی بولیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ علاقہ ڈُگر یا ڈُگر دیس کے نام سے بھی موسوم ہے۔ سٹائین کے خیال کے مطابق یہ علاقہ ڈُگر اس لئے کہلایا کہ یہ بہت دشوار گذار اور محنت طلب علاقہ ہے۔ اور "دورگرہ" کے لفظ سے بنا ہے، جس کے معنی سخت اور سخت کوش کے ہیں۔ لیکن ڈی۔ سی۔ پرشانت نے اسے راجستھانی کے لفظ "ڈونگر" سے مشتق بتایا ہے۔ جس کے معنی پہاڑی خطے کے ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ راجستھان کے ان پرباسیوں کے ساتھ یہاں آیا، جو صدیوں قبل اس علاقے میں منتقل ہوئے تھے۔ چنانچہ ڈوگرا لوگ، اپنا تعلق راجپوتوں سے ہی بتاتے ہیں۔ ڈوگری کا لفظ زبان کے لئے "ڈُگر" ہی سے مشتق ہے۔

ڈوگری زبان کا تعلق اس طرح سے راجستھان سے ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی نے اسے ہند آریائی کی پہاڑی شاخ مانا ہے، پہاڑی کی تین ممیز بولیاں ہیں، مشرقی، جو نیپال میں بولی جاتی ہے اور نیپالی کے نام سے موسوم ہے، دوسری شاخ گڑھوالی اور کماؤنی ہے، مغربی پہاڑی، کی بولیاں پونچھ، جونسر، ڈیرہ ڈون کے

یک حصے اور جموں میں بولی جاتی ہیں۔ مغربی پہاڑی بولیاں ۸۲۰۰۰ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہیں۔

گریرسن نے ڈوگری کو پنجابی کی بولی بتایا ہے، لیکن ڈوگری کے علماء اس رائے سے متفق نہیں ہیں اور ڈاکٹر سدھیشور ورما نے بھی اسے پنجابی سے مختلف اور علیحدہ زبان شمار کیا ہے۔ یہ نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ ڈوگری کا ماخذ شورسینی یا پہاڑی پراکرت ہے۔ ڈوگری پر پنجابی کا گہرا اثر ہے، جو ڈوگری کے پنجابی علاقے سے ملحق ہونے کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔

ڈوگری میں قدیم ادب نہیں ملتا۔ اس کی ادبی روایات صرف سو سال سے لگ بھگ پیچھے جاتی ہیں۔ یہ ڈوگرا راجہ رنبیر سنگھ کا عہد ہے۔ رنبیر سنگھ کو ڈوگروں اور ڈوگری کی ترقی کی بہت فکر تھی۔ چنانچہ انہوں نے جو دارالترجمہ قائم کیا تھا۔ اس میں سنسکرت، اردو اور فارسی کے علاوہ ڈوگری میں بھی ترجمے کرائے گئے تھے۔ وہ اس زبان کو سرکاری زبان بھی بنانا چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے لسانی گروہوں کے ڈر اور بیرونی لسانی دباؤ کی بدولت ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ تاہم ان کی کوششوں سے ڈوگری کے لئے ایک رسم خط مقرر ہوا، جو دیوناگری پر مبنی ہے اور اب ڈوگری اسی خط میں لکھی جاتی ہے۔

ڈوگری کی ترقی کی اس مساعی سے پہلے کا کچھ لوک ادب ملتا ہے۔ جو نظموں اور کہانیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جیسا کہ "ڈوگری فوک لٹریچر اینڈ پہاڑی آرٹ" کے مصنفین نے لکھا ہے، "ربع صدی کے پہلے تک ڈوگری میں ادبی روایات مسلسل نہیں ملتیں۔ جو آثار ملے ہیں، وہ نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ نثر میں کچھ کہانیاں، کہاوتیں اور معمے محفوظ ہیں۔ اس کے مقابلے میں نظمیہ ادب زیادہ وسیع اور متنوع ہے۔ ڈوگری نظمیں اپنے مخصوص روپ اور موضوع رکھتی

ہیں۔ ان میں بارہ ماسے اور کارکاں، گیت، عشق و محبت کے گیت اور مذہبی گیت شامل ہیں۔ اس کے علاوہ غنائی نظموں میں عشق و محبت کی نظمیں، مذہبی اور دیگر رسومات کے موقع پر گائی جانے والی نظمیں، ناچ، تہواروں اور موسموں میں گائی جانے والی نظمیں، بارہ ماسے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کچھ نظمیں بہادروں کے کارناموں پر بھی لکھی گئی ہیں۔

ڈوگری کی لوک کہانیاں جو اب تک اکٹھی ہو سکی ہیں، ان کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ ان میں سے نو کہانیوں کا مجموعہ بنسی لال گپتا نے مرتب کر کے ڈوگرا منڈل دہلی کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا ہے۔ دوسرا مجموعہ جو پندرہ کہانیوں پر مشتمل ہے "ڈوگری سننتھانے" ایک تھا راجہ "کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ڈوگری لوک کہانیوں کے موضوع متنوع اور مختلف ہیں۔ ان میں پریوں کی کہانیاں، تاریخی کہانیاں، انسانی سرشت، سے متعلق کہانیاں، عشق و محبت کے قصے، عقل و دانائی کی حکایتیں، جیسے وسیع موضوعات شامل ہیں۔ ان میں سے کئی سنجیدہ موضوعات پر بھی ہیں مثلاً " لالسہ دی ہڈی " کا موضوع انسان کی کبھی نہ سیر ہونے والی دولت کی بھوک ہے، جس کے لئے وہ ہر طرح کے کرتوت کر بیٹھتا ہے۔ " دسیتی آنے دی پکیم " کا موضوع حیرت انگیز طور پر جدید ہے۔ اس میں نظم و نسق کی بدعنوانیوں کی وجہ سے استحصال کی جو مکروہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا خاکہ اڑایا ہے۔ " اوڈنوں " کہانی کا موضوع بین لسانی ہے۔ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے بہن کو قتل کر دینے کی کہانی ہندوستان کی زبانوں میں عام ہے۔ اردو میں بھی اس نوع کی کہانی زبان زد ہے۔ بہن ایک آم کے درخت کی صورت میں نشو و نما پاتی ہے اور جب کوئی اس کے پھل توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے تو پیڑ سے گیت پھوٹتا ہے :

راجے دے سپاہیا، امب نیئوں تروڑ

ڈالی نیں مروڑ

سکے بھائیے بہن ماری

شو آدِ تا ڈدر

(راجا کے سپاہی آم نہ توڑ

ڈالی نہ مروڑ

سگے بھائی نے بہن کو مارا

چادر خوں میں لال رنگی)۔

کچھ کہانیوں میں حکایات لقمان یا ایسپ فیبلز کی طرح کے جانوروں کے قصے بیان ہوئے ہیں، لیکن ان میں بھی ایسپ کی حکایات کی طرح سے جانوروں کے خواص متعین ہیں۔ شیر بہادر ہے، گدھا بیوقوف، کوا چالاک، راج ہنس عقلمند ہے۔ اور یہ جانور دراصل انسانی صفات کی تمثیل ہیں۔

ایسی کہانیوں میں "شیرے دا دِل" "ہرگ تے گِدڑ" وغیرہ دلچسپ ہیں۔ ان کہانیوں میں طنز و مزاح کے مواقع بھی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان میں "شیخ چلی" کے مشہور قصوں کے علاوہ "للّی" "ڈومکا لدرا" "آلسی ٹبّر" وغیرہ بہت مقبول کہانیاں ہیں۔

ڈوگری گیتوں اور نظموں کے حسن اور ان کی خوبی میں مقامی رنگ اور سادگی جھلکتی ہے۔ باراں گیتوں میں بہادروں کے گن گائے جاتے ہیں اور کارکاں ولیوں اور مقدس ہستیوں کی عظمت کے گیت ہیں۔ کارکاں گیتوں میں باباجتو داناتو اور راج باہو راول کے گیت بہت مقبول گیتوں میں سے ہیں۔ باباجتو کنڑا کے قریب کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے، اپنے رشتہ داروں کی مخالفت سے شاماچک گاؤں میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں کے کمھیا لھتا میر سنگھ

والیٔ جموں کے رشتہ دار تھے۔ بیر سنگھ کی زیادتی نے انہیں خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعہ پر جو گیت لکھے گئے ہیں، بہت ہی المناک ہیں۔ راج باہو ماؤل کے گیت کانگڑہ کے مقبول گیتوں میں سے ہیں۔ 'باراں' ویروں کے گیت 'ہندی' ویر گاتھا کے مماثل ہیں۔ اور خیال یہ ہے "باراں" "گیت ہندی" "بیر" گیت دونوں ہم ماخذ ہیں۔ ان گیتوں میں تاریخ کی مشہور شخصیتوں کی عظمت بیان کی جاتی ہے اس طرح کے مشہور گیت میاں 'ڈیڈو' کی توصیف میں ہیں؛ جو مہاراجہ گلاب سنگھ کا معاصر تھا اور سکھوں کے حملۂ جموں کے موقع پر گلاب سنگھ کے دوش بدوش لڑکر سکھوں کو ہزیمت دی تھی۔ اس کے بعد جب سکھوں کا قبضہ جموں پر ہو گیا۔ اور گلاب سنگھ نے سکھوں کی ملازمت اختیار کر لی، تب بھی اس محب وطن نے جہاد رکھا اور آخر کار ایک سکھ سپاہی کی گولی کا نشانہ بنا۔ ڈگر دیش کے لوگ فطرتاً اس کو ہیرو مانتے اور اس کی بہادری کے گیت گاتے ہیں۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے جنرل، زور آور سنگھ کی توصیف میں بھی گیت لکھے گئے ہیں۔ زور آور سنگھ نے جموں کے اطراف کے علاقوں کو فتح کر کے ڈوگرا راج میں شامل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ فاتح لداخ بھی تھا۔ وزیر رتنو ایک اور ڈوگرا بہادر تھا جس نے زور آور سنگھ کے دوش بدوش لڑائیاں لڑی تھیں۔ زور آور سنگھ کے مرنے کے بعد جب لداخ نے بغاوت کی تو وزیر رتنو نے اس کو فتح کر کے جموں و کشمیر کی ریاست کا ایک جز بنا دیا تھا۔ اس کی توصیف بھی گیتوں میں بیان کی گئی ہے۔ دوسرے ڈوگرا بہادر، جن کی تعریف کے گیت ملتے ہیں، اتنگا، جنرل ہوشیارا، باج سنگھ اور رام سنگھ ہیں۔

باراں گیت ڈوگروں کے فخر و مباہات کے جذبات کے پورے مظہر ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں بڑی حد تک تاریخی واقعات سے تجاوز نہیں

لیا جاتا ہے بلکہ بعض مصنفین انہیں تاریخ سے زیادہ مستند مانتے ہیں۔ عشق و محبت کے گیت ڈوگری میں زیادہ نہیں ملتے۔ مشہور گیت "ہنس موری" اور "روپ بسنت" ہیں۔ "ہنس موری" میں ایک ہنس کی مورنی کے ساتھ محبت کی داستان بیان کی جاتی ہے اور "روپ بسنت" میں دو بھائیوں کی الفت کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ مذہبی گیتوں میں ڈوگرا دیس کے تیرتھوں اور دیوی دیوتاؤں کے گن گائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ رامائن اور مہابھارت کے واقعات پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مقدس ہستیوں کی عظمت پر بھی گیت لکھے گئے ہیں۔ غنائیہ نظموں میں 'عشق و محبت' کے موضوع کی نظمیں، تہواروں کے موقعوں کی نظمیں، ناچ کے موقعوں پر گائی جانے والی نظمیں، موسموں کے بارے میں نظمیں اور بارہ ماسے سبھی شامل ہیں۔

جدید دور سے پہلے کے شاعرانہ کارناموں میں 'دیوی دتا' کی ایک نظم ملتی ہے، جو رنجیت دیو کے زمانے میں گزرا ہے۔ یہ ایک نوجوان دلہن کی شکایت ہے، جو اپنی ساس اور نند کی بدگوئی سے پریشان ہو کر کنویں پر پانی لانے کے لئے جانے سے انکار کرتی ہے۔ ایک ڈوگری غنائیہ کا یہ نفیس نمونہ ہے۔ دیوی دتا کا بھتیجا، شو رام، برج بھاشا اور ڈوگری کی ہی جملی ایک نظم کا مصنف تھا۔ دیوی دتا کے پوتے نرو چن نے مہابھارت کے کچھ اجزا کا ترجمہ ڈوگری میں کیا تھا۔ دیوی دتا کے بھائی [illegible] رام کا پوتا رودر دت، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ہوا ہے۔ اس کی ایک [illegible] نظم دستیاب ہوتی ہے۔ پنڈت گنگا رام اسی عہد کا ایک اور شاعر تھا۔ جس نے گنڈی علاقے کی زندگی پر ایک نظم لکھی تھی۔

ایک اور شاعر رام دھن ڈوگری [illegible] دونوں زبانوں میں لکھتا [illegible]

اس کی ڈوگری نظم "چناں دی چاننی" دستیاب ہوتی ہے۔ جو رومانی ہے۔ یہ نظم کافی طویل ہے اور چار حصّوں پر منقسم ہے۔ بعض نقادوں نے رام دھن کا شمار ڈوگری کے عظیم شعرا میں کیا ہے۔

جدید ادب

ڈوگری کے جدید ادب کی شروعات، آزادی کے بعد سے ہوئی۔

آزادی کے بعد، جب لسانی اکائیوں کی اہمیت بڑھی، تو ڈوگری بولنے والوں میں بھی اپنی زبان اور ادب کو ترقی دینے کا احساس اُبھرنے لگا۔ اس سے کچھ قبل ۱۹۴۳ء میں ڈوگری سنستھا کا قیام عمل میں آیا تھا، جس کے اغراض و مقاصد میں، ڈوگری فن کے ساتھ ساتھ ڈوگری ادب کو بھی ترقی دینا تھا۔ اس نئے شعور کے بیدار ہونے کے ساتھ ہی، کئی نوجوان ادیب اور شاعر جو اُردو ادب کی روایات میں نشو و نما پائے تھے۔ ڈوگری میں اظہار خیال کو ترجیح دینے لگے اور اس زبان میں لکھنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدا میں ڈوگری کے ادیبوں اور شاعروں کو اُردو کے اسالیب اور انداز سے سہارا لینا پڑا، لیکن اُردو میں ترقی پسند تحریک کے عروج کے ساتھ ساتھ، ڈوگری میں بھی عوام سے ربط اور ان کے تصورات اور خیالات کی ترجمانی اور ان کے ذہنوں تک رسائی کی تحریک اُبھری۔ اس کے سبب سے موجودہ ڈوگری شاعری میں ایک نفیس اسلوب اور مقامی رنگ اُبھر رہا ہے۔ جدید ڈوگری ادب میں شاعری کے علاوہ، کہانیاں اور ناول لکھے جا رہے ہیں اور کچھ ناٹک بھی تصنیف ہو رہے ہیں۔

جدید ڈوگری شاعری کا آغاز "ماڈرن ڈوگری لٹریچر" کے مرتب پروفیسر نیلامبر دیو شرما نے ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ سمیال سے کیا ہے، جن کا انتقال

۱۹۶۳ء میں ہوا۔ وہ سانبہ کے رہنے والے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ گلگت میں بھی رہے۔ ٹھاکر کی ذہنی تربیت، قدیم اندازِ فکر میں ہوئی تھی، لیکن جب انہوں نے نوجوان شعراء کو اپنی زبان میں لکھتے دیکھا تو ان کی رگِ حمیت بھی پھڑک اٹھی اور وہ بھی ڈگر دیس اور ڈوگروں کی توصیف میں لکھنے لگے۔ تاہم ان کا انداز اصلاحی اور اخلاقی رہا۔ ان کے اسلوب میں زور اور جوش ہے۔ ٹھاکر کی نظمیں "ڈوگرا دیس جگائی جایاں" اور بہت مقبول ہوئی۔

ٹھاکر کے معاصرین میں پنڈت ہردت شاستری، مذہبی آدمی تھے۔ اور عوام میں کنھا واچک کے لقب سے مشہور تھے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں اپنے عہد کے تقاضوں کا شعور ملتا ہے۔ حبِ وطن کے جذبات سے ان کا دل مملو تھا۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "میرا دیس" اور "ڈوگرا دیس" بڑی مقبول تھیں۔ سماجی نظموں میں "فیشن" اور "بیکاری" اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی کچھ اصلاحی نظمیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔

سوامی برہمانند کی شاعری میں روحانی قدروں کا احساس نمایاں ہے۔ وہ اکھنور کے رہنے والے تھے، لیکن ان کی تعلیم جموں میں ہوئی اور یہیں ملازمت بھی کی۔ بعد میں بیوی کے انتقال کے بعد وہ سنیاسی ہو گئے تھے۔ فطرتاً زندگی اور اس کا عیش و آرام ان کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتا تھا اور اپنی نظموں میں وہ زندگی ایک دھوکا اور مایا ہونے کا پرچار کرتے رہے۔ ان پر ویدانت کا گہرا اثر تھا۔ روحانی سکون کے حصول کے لئے وہ خواہشات کو قابو میں رکھنے پر زور دیتے رہے۔

ہردت کے معاصرین میں مولراج مہتا نے بھی شہرت حاصل کی لیکن ان کی صرف ایک نظم "جیڑا پہاڑی داتما" بہت مقبول ہوئی۔ نظم میں پہاڑی زندگی

کا نقشہ دِلکش انداز میں کھینچا ہے۔ ان کے زمانے میں جگناتھ کالرا بھی منظرِ عام پر آئے۔ کالرا کی نظمیں طنز و مزاح کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ کرشن سمیل پوری، ڈوگری اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ان کا تذکرہ اُردو لکھنے والوں میں بھی آرہا ہے۔ جب ڈوگری میں شعر کہنے کی طرف توجہ ہوئی تو اُردو شاعری کی طرح ان کی ڈوگری شاعری میں بھی حُبِ وطن کے جذبات اُبھرے۔ دیس کی ناگفتہ بہ حالت انہیں سماجی انقلاب کے گیت گانے پر مائل کرتی ہے۔ اُردو غزل میں پوری مہارت نے، ان کے قلم سے ڈوگری میں چند نفیس غزلیں کہلوائی ہیں۔ ان کی ڈوگری غزلیں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ کرشن سمیلپوری نے گیت بھی اچھے لکھے ہیں، جو ڈوگری بولنے والوں میں بڑے مقبول ہیں۔

پرمانند المست نے بھی پہاڑی زندگی کے گیت گائے ہیں۔ وید راہی جنھوں نے ڈوگری شاعری کا تذکرہ "جگدیاں جوتاں" کے نام سے مرتب کیا ہے، المست کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"المست کی شاعری کا لوگوں کے دِلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ سب سے زیادہ نزدیکی رِشتہ ہے۔ والہانہ پن، رسیلا ترنم، سوز و گداز، سرمستی و سرشاری ان کی شاعری کے خاص عناصر ہیں"

المست کی کچھ نظمیں دیس کی عظمتِ گذشتہ سے متعلق بھی ہیں۔ پنڈت شمبو ناتھ کی اخلاقی اور سماجی نظموں نے اپنے اسلوب کی صنعت گری کی بدولت ان کے لیے ڈوگری ادب میں ایک اونچا مقام پیدا کر دیا ہے۔ رام لال شرما کا رجحان بھگتی کی طرف زیادہ ہے، ان کی نظموں کے مجموعہ "کرن" پر انہیں اکادمی کی جانب سے انعام عطا ہوا تھا۔ برکت رام پہاڑی، پہلے اُردو اور پنجابی میں شعر کہتے تھے لیکن ڈوگری میں لکھنے کی تحریک شروع ہونے کے بعد انہوں نے بھی ڈوگری میں شعر

لکھنا شروع کیا اور بہت مقبولیت حاصل کرلی۔ ان کی نظموں میں حُبّ وطن کے جذبات اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ "اٹھو شیر جوانو" ان کی مقبول نظم ہے۔ برکت کی خیال زا نظموں میں "موتی" "مُنکھ تے پنچھی" اخلاقی اور فکری نظمیں ہیں۔

درگا داس چمک، بھی پہلے اُردو اور پنجابی میں لکھتے تھے، بعد میں جب ڈوگری میں لکھنے لگے، تو اپنے دیس کے اور لکھنے والوں کی طرح، انہوں نے بھی ڈُگر دیس کی عظمت کے گیت گانے شروع کئے۔ اس سے انہیں بہت مقبولیت حاصل ہوگئی، بعد میں، انہوں نے اخلاقی اور فلسفیانہ موضوعات پر بھی لکھا۔

پنڈت رام ناتھ شاستری، جو مولانا آزاد میموریل کالج میں سنسکرت کے پروفیسر ہیں ڈوگری کے صاحبِ فکر ادیبوں میں سے ہیں۔ پہلے وہ ہندی میں لکھتے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے "باوا جتو" کے عنوان سے ایک ناٹک لکھا تھا، جو کئی دفعہ اسٹیج پر پیش کیا گیا اور ڈوگری کے کامیاب ناٹکوں میں شمار ہوتا ہے۔ بعد میں انہوں نے نظمیں بھی لکھنی شروع کیں۔ جو دوسرے شعراء کی نظموں کے ساتھ مجموعہ "جاگو ڈُگر" میں شائع ہوئی ہیں۔ شاستری بھی ڈوگرا دیس کے گیت گاتے رہے۔ ان کی بعد کی نظموں میں ترقی پسند رجحانات بھی ظاہر ہوئے ہیں، گھریلو مناظر کی تصویر کشی میں ان کی نظم "چکی" بے مثل مانی گئی ہے۔ "امرا یہہ منگھتا" میں شاستری نے انسانی عظمت اور اس کے دوام کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر شاستری نے ڈوگری میں غزلیں بھی لکھی ہیں۔ وید راہی نے شاستری کی شاعری کو فکری شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ "امرا یہہ منگھتا" "در" "دھرتی دا رن" "روپ گنڈ" شاستری کی اہم نظمیں ہیں، جن میں رجائی رجحانات قابلِ قدر ہیں۔

دینو بھائی پنت نے ڈوگری شاعری کو ایک نیا آب و رنگ بخشا۔

لہ ۔ شاستری جی کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر آج کل کلچرل اکیڈیمی کے شعبۂ ڈکشنری میں کام کر رہے ہیں۔

ان کی نظموں میں نیا سیاسی اور سماجی شعور ملتا ہے۔ ان کی کچھ نظمیں بھی مجموعہ "جاگو ڈگر" میں شایع ہوئی ہیں۔ "ایہہ دنیا" "اُٹھ تھوبا" "جاگ کسانا تیرا جیلا آیا اُو" دینو بھائی کے ترقی پسند خیالات کی مظہر ہیں۔ ڈگر دیس کے حُسن پر بھی وہ فدا ہیں۔ ان کی نظم "جے جے ڈگر دیس سہانا" حُبِ وطن کے جذبات کی آئینہ دار ہے۔ ان کی دوسری نظموں میں "شہر پہلو پہل گے" اور "غلامی دا جینا" بھی مقبول ہیں۔ دینو بھائی ہندی اور اُردو میں بھی لکھتے ہیں۔ اُردو میں ان کے ناٹک "سورگ کی کھوج" کا ذکر اُردو ادب کے ضمن میں آرہا ہے۔

ڈوگری شاعروں کے اس قافلے میں رفتہ رفتہ اور لکھنے والے بھی شامل ہوتے گئے۔ ان میں درگادت شاستری نے اپنی مذہبی نظموں کی بدولت امتیاز حاصل کیا، گنگادت ونود کی نظموں میں صوفیانہ جھلک ملتی ہے، بال کشن، انقلابی جذبات سے مملو شعر کہتے ہیں، رام لال گپتا نے آزادی کے بعد کی نشاۃ ثانیہ پر کچھ نظمیں لکھی ہیں۔ رام کشن شاستری، اخلاقی شاعر ہیں۔ تارا سمیل پوری کو نیلامبر دیو شرما نے "عوامی شاعر" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان پر دینو بھائی کا گہرا اثر ہے۔ ان کی نظموں میں تلخ و تُند طنز بھرا ہوتا ہے۔

یش شرما پہلے ہندی میں لکھتے تھے۔ ڈوگری میں انہوں نے بھی حُبِ وطن کے گیتوں سے آغاز کیا، رفتہ رفتہ کسانوں اور مزدوروں کے مسایل ان کی دلچسپی کا موضوع بنتے گئے۔ اونکار سنگھ آوارہ، پہلے کہانی لکھتے تھے۔ وہ اردو اور ہندی ادب کے اچھے متعلم ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز نے انہیں، زندگی کے تجربوں کا اچھا موقع دیا، اور ان تجربوں کو انہوں نے اپنی نظموں میں سمویا ہے۔ "چور" ان کی بہت مشہور نظم ہے، جس میں ایک شب رو کے جذبات اور احساسات کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔

کھڑسنگھ مدھوکر کی مساعی نے ڈوگری شاعری کے اُفق کو وسعت دی، وطنی شاعری میں انھوں نے نئے جہات پیدا کئے۔ ان کی نظم " دیشا گی بنانا تے مٹانا تُندے ہتھ ایہہ" بہت مشہور ہوئی۔ کچھ مشاہیر پر بھی انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ شیام دت پراگ بھی پہلے ہندی میں لکھتے تھے۔ اور جب ڈوگری میں شعر کہنے لگے تو ہندی نظم کی تیکنیک سے عمدگی کے ساتھ کام لیا۔ انھوں نے ٹیگور کی " اِک سَو ایک نظمیں " کا ترجمہ بھی ڈوگری میں کیا ہے۔ وید پال دیپ، ہندی کے عالم اور اُردو اور انگریزی ادب کے اچھے متعلم ہیں۔ وہ بھی پہلے ہندی میں لکھتے تھے۔ بعد میں ڈوگری میں لکھنے لگے۔ ڈوگری میں ان کی نظمیں حُبِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ ترقی پسند تحریکوں کا بھی ان پر اثر ہے۔ آزادی کے حصول سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ اصلی آزادی ان کی نظر میں کسانوں اور مزدوروں کی آزادی ہے۔ ان کی نظم " کل ہا میں کلّا میرے ساتھی نیئں گنون اَج" موضوع سے قطعِ نظر، تکمیل اور فن کے اعتبار سے بھی ایک حسین نظم ہے۔ دیپ نے ڈوگری میں غزلیں بھی کہی ہیں۔ کشن دت بھی ترقی پسند شاعر ہیں۔ موہن لال سپولیا، کشن سمیل پوری، دینو بھائی پنت اور پروفیسر رام ناتھ شاستری سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی شاعری میں داخلیت اور خارجی خاکہ کشی دونوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ " فاقہ " ان کی عمدہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔

رندھیر سنگھ، نئی نسل کے شعراء میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تخیّل کی کارفرمائی، ایک انفرادیت پیدا کردیتی ہے۔ وہ اُردو ادب کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔

پدما شرما، ڈوگری کی واحد شاعرہ ہیں، جن کی نظموں میں ذہنی بلوغ اور اظہار کی بلاغت دونوں کا شائبہ نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں کچھ ترقی پسندی

ف ۱۔ سردمنی صاحب کی یہ معلومات صحیح نہیں۔ ٹیگور کی ایک سو ایک نظموں کا ڈوگری میں ترجمہ نرسنگھ مدھوکر نے کیا ہے۔

کے رجحان نمایاں ہیں۔ "راجے دیاں منڈیاں" ان کی غالباً سب سے اچھی نظم ہے۔ اس کے علاوہ "ویجوگ" "دو پکھرو" "ماودی پچھان" اور چند اور حسین نظمیں ان کے افکار کی نمائندہ ہیں۔

چرن سنگھ نے عشق و محبت کے گیت لکھے ہیں، کچھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کے اسلوب اور اظہار میں ایک انفرادیت ہے۔ "میلہ" ان کی عمدہ نظموں میں گنی جاتی ہے۔

کہانی

ڈوگری میں شاعری نے جس قدر جلد ترقی کے مدارج طے کئے نثر کو اس قدر موقعے نہیں ملے۔ تاہم ڈوگری لکھنے والوں نے جلد ہی یہ کمی محسوس کر لی پروفیسر رام ناتھ شاستری، ابتدا ہی سے کہانی لکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ذوق اسقدر ترقی کر گیا ہے کہ اس وقت ڈوگری کے ادیبوں میں اچھی صلاحیتوں کے کہانی لکھنے والوں کی تعداد کافی ترقی کر گئی ہے۔ پروفیسر رام ناتھ شاستری کے بھائی وشوا ناتھ کھجوریہ، اس میدان میں آزادی ہند سے بھی پہلے آ گئے تھے۔ انہوں نے چند نفیس کہانیاں لکھی ہیں۔ کہانی کے علاوہ، ان کے قلم کی جولان گاہ ادب کے کئی شعبے ہیں۔ وشوا ناتھ نے کچھ ایک انکی ناٹک، اور کچھ انشائیے بھی لکھے ہیں۔ جموں کے لوک ناچ اور لوک ساہتیہ پر ان کا کام مستند مانا جاتا ہے۔

ابتدائی نثر لکھنے والوں میں بھگوت پرشاد ساٹھے بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ "پہلا پھُل" کے عنوان سے مرتب اور شایع ہوا ہے۔ اس میں کئی کہانیاں تاریخ اور روایت کا مجموعہ ہیں۔ تاہم ان میں اپنے عہد کے مسایل بھی جگہ پا لیتے ہیں۔ ساٹھے کا اسلوب بیان سادہ پرکار ہے۔

رام کمار ابرول ڈوگری اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوع ڈوگرا عوام ہیں اور ان کی خوشیوں اور دکھوں، ان کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں، اور ان کی اُمیدوں اور ان کے خدشوں کو وہ بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ "پیریں دے نشان" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے۔

نیلامبر دیو شرما جو اب کلچرل اکادمی کے سیکرٹری ہیں۔ انگریزی ادب کے عالم ہیں، اور مختلف کالجوں میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انہیں پہاڑی علاقوں میں کافی گھومنے پھرنے کا موقع ملا ہے۔ اور ان علاقوں میں رہنے بسنے والوں کے عادات و اطوار کا انہوں نے قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ تاثرات اور تجربات ان کی کہانیوں میں راہ پاتے ہیں۔ ان کی زبان شہروں کی زبان ہے، جس پر اُردو اور پنجابی کا اثر ہے۔ "جیب کترا" "بھٹکے دا نانو" (بھٹکا مسافر) "ترائے بہناں" (تین بہنیں) اچھی کہانیاں ہیں۔ لیکن ان کی تخلیق "پہاڑے دی کہانی" شاید سب سے بہتر کہانی ہے، جس میں پہاڑی علاقوں میں رائج رسم، لین دین اور "بیاہ" کی بعض برائیوں کی طرف ضمنی انداز میں اشارے ملتے ہیں۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے، انگریزی سے قریبی واقفیت، ان کی کہانیوں کے معیاروں کو بلند کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔

پروفیسر رام ناتھ شاستری کے چھوٹے بھائی نریندر کھجوریہ بھی کہانی لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوع وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کا انہیں تجربہ ہے اور جن کی زندگی اور خیالات کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ اسی لئے ان کی کہانیوں میں حقیقت پسندی کا شائبہ جھلکتا ہے۔

نریندر کی کہانیوں کا مجموعہ "کولے دیاں لیکراں" ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا۔ اس میں ڈوگری کی بعض اچھی کہانیاں شامل ہیں۔ وید راہی انھی کے حلقے کے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ وہ اُردو اور ڈوگری دونوں زبانوں میں کہانیاں لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ لیکن "ماڈرن ڈوگری لٹریچر" کے مصنف نے ان کی نثر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ راہی کی کہانیوں کا مجموعہ "کالے ہتھ" ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا۔ ان کہانیوں میں وہ اپنے جانے پہچانے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ اور خوبی سے پیش کرتے ہیں کرداروں کی نفسیاتی گتھیوں میں داخل ہونے اور ان کے تحت شعور میں جھانکنے کی کوشش کے عمدہ نمونے ان کی کہانیوں "منواداکرتا" اور "چھٹ" میں ملتے ہیں۔ راہی کی زبان پر بھی اُردو اور پنجابی کا اثر ہے۔ راہی نے حال ہی میں ٹیگور کی اکیس کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جو کلچرل اکادمی کی جانب سے شایع ہوا ہے۔

اُردو کے ایک اور کہانی کار جو اب ڈوگری میں بھی لکھتے ہیں، مدن موہن شرما ہیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "کیجراں نو تھا جیہ" ۱۹۵۹ء میں ڈوگری سنستھا جموں نے شایع کیا۔ کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر رام ناتھ شاستری نے وضاحت کی ہے کہ شرما کی کہانیوں میں انسانی زندگی سے متعلق دل دُکھانے والے منظر ملتے ہیں۔ کہانیوں کے موضوع اور اسلوب دونوں میں نزاکت ہے اور ہر کہانی میں زندگی کی جھلک موجود ہے۔ اس کے علاوہ طنز و مزاح کی چاشنی بھی شرما کی کہانیوں میں نمایاں ہے۔

للتا مہتہ، نوعمر خاتون کہانی کار ہیں۔ ان کا مجموعہ "سوئی تاگا" زیادہ تر گھریلو زندگی اور مسایل کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ کئی کہانیوں میں غریبوں کی حوصلہ فرسا زندگی پر بھی آنسو بہائے ہیں۔ کوی رتن شرما ایک نوجوان افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیاں رسالوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ "ڈولی" "دادی" اور "شیرو" ان کے

اچھے افسانے ہیں۔

چرن سنگھ حال ہی میں کہانی بھی لکھنے لگے ہیں۔ ان کی ایک کہانی "کلپنا" اچھی صلاحیتوں کی مظہر ہے، اور ڈوگری کی قابلِ مطالعہ کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ڈراما

ڈوگری میں ڈراما اور اصناف ادب کے مقابلے میں کم عمر ہے۔ ۱۹۴۸ء میں وشوا ناتھ کھجوریا اور ڈی۔ سی۔ پرشانت نے ڈرامے لکھے تھے۔ جو اسٹیج پر پیش بھی کئے گئے۔ پروفیسر رام ناتھ شاستری نے "باوا جتو" ڈراما اس کے بعد ہی لکھا۔ ان کی مثال سے بہت سے نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی ہوئی اور وید راہی نریندر کھجوریا، دینو بھائی پنت، رام کمار ابرول وغیرہ نے بھی ڈرامے لکھنے شروع کئے۔

رام ناتھ شاستری، دینو بھائی پنت اور رام کمار ابرول کی متحدہ سعی سے ۱۹۵۷ء میں "نماں گراں" نامی ڈراما لکھا گیا۔ اس ڈراما کی تصنیف کے بارے میں رام ناتھ شاستری نے لکھا ہے کہ اس کے لکھنے میں ڈوگر دیس کی باز تعمیر کا احساس ہمارا محرک ہوا۔ یہ ناٹک ادبی محاسن اور ادبی نشر میں گویا ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔ اس کا پس منظر دیہات کی زندگی ہے اور نئے حالات اور قدیم روایات کا تصادم اس کا مرکزی موضوع ہے۔ پروفیسر شاستری نے ٹیگور کے ڈراما "بھینٹ" کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

اس ڈراما کی کامیابی نے دوسرے ادیبوں کو بھی ڈراما لکھنے پر ابھارا۔ چنانچہ وید راہی کا "دھاریں دے اتھرو" اور دینو بھائی پنت کے ڈرامے "سرپنچ" اور "سنجالی" اور پروفیسر رام ناتھ شاستری کا "سار" جلد ہی منظر عام پر آئے۔

وید راہی کے ڈراما کا موضوع، ڈوگر دیس کی پُرانی رسم "دو ہری" ہے۔ اس موضوع پر راہی نے اُردو میں بھی ایک کہانی لکھی ہے۔ اس کہانی کے لکھنے سے بیاہ کی خرابیوں کو پیش منظر میں لانا راہی کا مقصد تھا۔ لیکن ڈراما فنی خوبیوں اور ڈرامائی مواقع سے خالی نہیں ہے۔

دینو بھائی پنت نے رام ناتھ شاستری اور رام کمار ابرول کے ساتھ مل کر جو ڈراما لکھا تھا، اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور اچھا ڈراما "سر پنچ" بھی لکھا، جو کئی حیثیتوں سے ممتاز ڈراما ہے۔ بانگی اور چودھری کے درمیان گھمر بلو جھگڑے میں رُنو سرپنچ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کا فیصلہ چودھری کے حق میں ہوتا ہے۔ جس سے ناراض ہوکر بانگی، کچھ اور لوگوں کے ساتھ سازش کر کے رُنو کو قتل کرا دیتا ہے اور خود علاقے کا مکھیا بن بیٹھتا ہے۔ لیکن ڈراما نگار اس کے ناجائز طریقے سے حاصل کئے ہوئے اقتدار کو فروغ پانے نہیں دیتا اور "تلافی" کے اصول کو داخل کر کے اسے اپنے مظالم کے کیفر کردار کو پہنچاتا ہے۔ دینو بھائی کا دوسرا ڈراما "سنبھالی" اتحاد باہمی کے موضوع پر ہے۔ ان کا اُردو ڈراما "سورگ کی کھوج" بھی چھپ چکا ہے۔ جس پر آئندہ گفتگو کی جا رہی ہے۔

رام کمار ابرول کا ڈراما "دھیری" جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ دیہات میں مروجہ دوہری کی رسم کے خلاف ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک اور کہانی ــــ "غیبر نُو دا تُل" بھی لکھی تھی۔ ڈراما میں کردار نمایاں اور مشخص ہیں۔ ابرول خود اچھے اداکار ہیں اور انہوں نے حتی الامکان اپنے کرداروں کو زندگی بخشنے کی کوشش کی ہے، اس کے باوجود نیلامبر دیو شرما اس ڈراما پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے کردار، کرداروں کے سایے معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم یہ ڈراما اچھی اداکاری کی وجہ سے اسٹیج پر بہت کامیاب رہا۔

ادھر کچھ عرصہ سے ڈوگری ادیبوں کی توجہ ناول نگاری کی طرف بھی ہو گئی ہے۔ اس وقت تک تین چار اچھے ناول لکھے جا چکے ہیں۔ نریندر کھجوریہ نے ایک اچھا ناول "شانو" کے نام سے لکھا ہے جو دیہات کے سدھار سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ موضوع بہت پہلے ان کی کہانیوں "دِتّن بار" اور "دھرتی دی بیٹی" میں برتا جا چکا تھا۔ لیکن ناول میں انہیں شرح و بسط کے ساتھ اسے پیش کرنے کی گنجائش تھی۔ ان کا ایک اور ناول جو "مردوے دی ڈالی" کے نام سے موسوم ہے، زیر تصنیف ہے۔ وید راہی کا ناول "ہاڑ بیڑی تے پتن" ایک تمثیلیہ ہے جس میں "ہاڑ" (طوفان) دراصل اس طوفانِ حوادث کا اشارہ ہے جو غریب آدمیوں کی زندگی کو تہہ و بالا کر رہا ہے۔ "بیڑی" (ناؤ) کا استعارہ ان لوگوں سے ہے جو مصیبت زدہ عوام کو طوفانِ حوادث سے بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

مدن موہن شرما کا ناول "دھاراں تے دھوڑاں" (چوٹیاں اور کہرا) سیاسی جدوجہد کی داستان کو پیش کرتا ہے اور نئے حالات میں جاگیردارانہ سماج کی زوال آمادگی کا عکس اس میں بخوبی ملتا ہے۔

پنجابی زبان اور ادب

پنجاب ریاست جموں و کشمیر کا ملحق علاقہ ہونے کی وجہ سے پنجابی کا تعلق ریاست سے گہرا رہا ہے۔ اہلِ پنجاب، کشمیر میں تجارت یا ملازمت کے تعلق سے قدیم زمانے سے آتے جاتے رہے۔ کچھ سیر و سیاحت کے مقصد سے بھی آتے تھے۔ اسی طرح کشمیر کے لوگ بھی پنجاب جاتے تھے اور کشمیر آنے والے یا پنجاب جانے والے، اپنے خاندانوں کے ساتھ وہیں رہ بس بھی گئے۔ لیکن کشمیر پر سکھوں کے تسلط کے بعد، پنجابی بولنے والوں کی وسیع تعداد کے یہاں آنے اور بسنے کے مواقع زیادہ ہو گئے۔ چنانچہ ایک مصنف نرگس[1] جی نے پنجابی زبان کے ریاست میں پھیلنے کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں جو "یوجنا" (۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا ہے، لکھا ہے:

"اٹھارویں صدی کے وسط میں جب راجہ رنجیت دیو یہاں راج کرتے تھے اور اُن دنوں پنجاب میں انتشار کا دور دورہ تھا۔ یہاں تک کہ جنتا کی روزمرہ ضروریات کا پورا ہونا بھی مشکل ہو چکا تھا تو پنجاب کے لوگ، جموں، بسوہلی، جسروٹہ اور اکھنور میں آکر آباد ہو گئے"

پنجابی بولنے والے اس وقت ریاست کے مختلف حصوں میں آباد ہیں، جموں صوبے میں پونچھ کا علاقہ اور کشمیر میں بارہ مولہ اور اطراف و جوانب

---

[1] ہمدر سنگھ داس نرگس

کے دیہات میں سکھوں اور پنجابی بولنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ریاست میں پنجابی بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ انہیں اعداد کی بنا، پر ڈاکٹر گوپال سنگھ نے اپنی کتاب "پنجابی ادب کی تاریخ" میں یہ اندازہ بتایا ہے کہ ریاست کا ہر چوتھا آدمی پنجابی بولتا ہے۔

پنجابی کا کشمیری زبان سے کچھ دُور کا اور ڈوگری سے نزدیک کا رشتہ بھی ہے۔ جموں کے مغربی علاقوں، جیسے پونچھ اور پہاڑی خطوں کی بولی جیسے جیسے ہم پنجاب کی طرف کو بڑھتے ہیں۔ پنجابی کی طرف مایل ہوتی جاتی ہے۔ ڈوگری اور پنجابی کی گہری مماثلت کی وجہ سے ایک زبان بولنے والا، دوسری زبان آسانی سے سمجھ بھی سکتا ہے۔ جموں کے پہاڑی علاقے کے ساتھ ملا ہوا، میدانی علاقہ قدیم زمانے سے، پنجابی سے متعارف اور متاثر بھی رہا ہے۔ گریرسن کے نظریہ کے مطابق" جموں اور اطراف کے علاقوں کی زبان، پہاڑی 'پنجابی کی ایک شاخ ہے۔ لیکن ڈوگری کے علما، گریرسن کے اس نظریئے سے متفق نہیں ہیں۔ شریمتی سُرجیت مہندر سنگھ نے اپنے مضمون" ریاست میں پنجابی کا ارتقاء" میں اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ جموں، سانبہ، اکھنور، کٹھوعہ اور ہیرانگر کے زیریں علاقوں کی زبان اور رنبیر سنگھ پورہ کی زبان میں بڑی مشابہت ہے اور دونوں علاقوں کے لوک گیت، سہاگ، اور گھوڑیاں اور کاروباری زبان کے لفظوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔

پنجابی کا اثر جموں سے گذر کر، کشمیر میں بھی تھوڑا بہت دکھائی دیتا ہے لیکن کشمیر میں پنجابی بولنے والے، جموں اور رام بن کے موجودہ راستے سے نہیں آتے تھے۔ بلکہ اُن کا قدیم راستہ بارہ مولہ اور اوڑی سے ملتا ہوا راولپنڈی کو جاتا تھا اور

یہ راستہ تقریباً سال بھر کھلا رہتا تھا۔ جس کے سبب تاجروں، سیاحوں، یاتریوں اور ملازمت کی خاطر کشمیر آنے والوں کو زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اسی تعلق کی بنا پر کشمیری اور پنجابی میں لفظوں اور خیالات کا لین دین بھی رہا ہے۔

گریرسن کی توضیحات کے مطابق، بیرونی حلقے کی زبانوں میں کئی مشابہتیں ہیں۔ چنانچہ کشمیری اور پنجابی کی مغربی بولی لہنداؔ میں بعض لسانی اشتراک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سنسکرت (ہند آریائی) گروہ کی زبانوں کے بعض لفظوں کی ابتدا میں "س" کی جگہ کشمیری میں "ہ" ملتا ہے اور اس خصوصیت میں کشمیری لہندا کے ساتھ شامل ہے۔ مثال کے طور پر ہند آریائی "سب" کے لئے لہندا میں "ہب" ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیری اور لہندا میں کچھ اور مشابہتیں یہ ہیں:

کشمیری	لہندا
مَنز (میں)	مَنجھ
ژنگ (ٹانگ)	جَنگھ
گھسُن	گھسناں (جانا۔ سنسکرت "گھ")

پنجابی کا اثر جموں اور کشمیر میں بولی جانے والی اردو میں بھی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر "نکا" (چھوٹا) کا استعمال یا "مت" "نہیں" کی جگہ جیسے "وہ مت آئے گا" (وہ نہیں آئے گا) کشمیری اور پنجابی نے الفاظ کے لین دین کے علاوہ ادبی موضوعات، اور ان کے روپ کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر کچھ مقبول داستانوں جیسے "سیف الملوک" "ہیر رانجھا" "سوہنی مہیوال" وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جن پر کشمیری شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح کشمیر کا مشہور قصہ "ہیہ مال ناگ رائے" پنجابی میں بھی پہنچ گیا ہے۔

سکھوں کے عہدِ حکومت میں ریاست کے لوگوں اور خاص طور پر جموں والوں کا تعلق پنجاب اور پنجابی بولنے والوں سے گہرا رہا ہے۔ پہلے ڈوگرا حکمران، مہاراجہ گلاب سنگھ رنجیت سنگھ کی ملازمت کے سلسلے میں عرصہ تک لاہور میں رہ چکے تھے۔ اسی طرح ان کے بھائی راجہ دھیان سنگھ اور بیٹے اودھم سنگھ کو بھی لاہور دربار میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس لحاظ سے ان کے لئے پنجابی اجنبی زبان نہیں تھی۔

پروفیسر سیوا سنگھ کی عہد بندی کے مطابق، کشمیر میں پنجابی شاعروں کے ارتقاء کو شاعری کی خصوصیات کے لحاظ سے دو وسیع ادوار پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قدیم روایتی شاعری کا دور دوسرا جدید دور۔ روایتی شاعری کے دور میں بھی کشمیر میں پنجابی شاعری کے دو رجحان رہے۔ ایک صوفیانہ شاعری دوسرے منظوم داستان نگاری۔ انہیں ہم سرسری طور پر دو ذیلی ادوار کہہ سکتے ہیں۔ اکثر زبانوں کی طرح یہاں بھی پنجابی ادب کا آغاز شاعری سے ہوا۔ قدیم روایتی انداز کی صوفیانہ شاعری کم و بیش اٹھارویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک مقبول رہی۔ جہاں تک صوفیانہ عقاید کا تعلق ہے۔ اس میں سکھ اور اسلامی دونوں طرح کے رجحان ملتے ہیں۔ سکھ صوفیوں میں سب سے پہلا نام بابا سنت دین کا ہے۔ جنہوں نے اپنی صوفیانہ شاعری میں سکھ مذہب کے عقاید کی ترجمانی کی۔ ان کے سلسلے کے دوسرے شاعروں میں گیانی دلیپ سنگھ سودن، گیانی کرتار سنگھ کومل، لشن سنگھ کریٹ اور گیانی اوتار سنگھ خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پرمانند، جو فارسی، کشمیری، ہندوستانی اور پنجابی کی ملی جلی بولیوں میں لکھا کرتے تھے، ٹھیٹ پنجابی کے شاعر تو نہیں تھے، لیکن وہ گرو نانک جی کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے اور کشمیر میں بھگتی شاعری میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا اصلی نام نند رام تھا اور مٹن کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پٹواری تھے اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ پرمانند نے بھی فارسی پڑھی تھی اور باپ کے

بعد، پٹواری کی خدمت پر مامور ہوئے تھے، لیکن آخر عمر میں یہ کام ترک کر دیا تھا، اور اپنے دھیان گیان میں مشروف رہا کرتے تھے۔ انہوں نے کئی لیلائیں لکھی ہیں، جو ہندوستانی اور پنجابی کی ملی جلی بولیوں میں ہیں۔ اُن کا انتقال ۱۸۸۰ء میں ہوا اور نوے برس کی عمر پائی تھی۔ پرمانند کے کارناموں کو ماسٹر زندہ کول ثابت نے مرتب کرکے، تین جلدوں میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اسلامی صوفیانہ عقاید کی ترجمانی ہم کو سائیں قادر بخش، نواب الدین چودھری رحیم اللہ بیگ، بابا صاحب لاروی اور میاں نظام الدین کی شاعری میں ملتی ہے۔ نواب الدین چودھری[1] ڈھوک گوجراں کے رہنے والے تھے۔ اُن کی تصنیف "خزینۃ الواعظین" ۱۸۰۵ء میں لکھی گئی۔ اُن کا ایک شعر ہے

شعر میرا ایہہ خام عزیز و پڑھ دیکھو اس تائیں

پڑھو، سُنو تے عمل کماو کرم کرے رب سائیں

منظوم داستانیں انیسویں صدی کے وسط سے لکھی جانے لگیں۔ سب سے پہلی داستان میاں محمد بخش کی مثنوی "سیف الملوک" ہے جو ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی۔ ملک محمد جائسی کی "پدماوت" اور ملا وجہی کی "سب رس" کی طرح، قصے کے پیرایہ میں متصوفانہ خیالات کو پیش کرنے کی یہ بھی ایک کوشش ہے۔ محمد بخش سموانی[2] گاؤں ضلع میرپور کے رہنے والے تھے، شریمتی سرجیت مہندر نے انہیں ریاست کا پہلا پنجابی شاعر لکھا ہے اور اُن کی دوسری مثنویوں، "سوہنی مہیوال"، "شیریں فرہاد"، "شاہ منصور" کے علاوہ "مرزا صاحبان" کا بھی ذکر کیا ہے۔ محمد بخش نے غزلیں، دوہے، اور کچھ سی حرفیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کی ایک نظم کے کچھ شعر ہیں:

لد گئے اوہ یار پیارے قدر شناس ہمارے

سخن شناس محمد بخشا لا لاں دے ونجارے

---

[1] یہ پتہ نہیں، اس گاؤں کا نام مرتوی صاحب نے کہاں سے پایا۔ میاں صاحب کے گاؤں کا نام کھڑی بتایا جاتا ہے۔

مجلس بہہ بہہ گئے سیانے کر کر ہوش سنبھالے

چک دوئے سنگ الفت جیون کھلیاں دے وچارے

لے لے گئے سخن دی لذت پی پی مست پیالے

خالی رہ گئے مٹّ محمد خالی مجلس والے

دوسرے مثنوی نگار داس مل، کرتار سنگھ کومل اور مولوی رحیم بخش ہیں۔ داس مل، جموں کے رہنے والے تھے۔ وہ پانچ مثنویوں کے مصنف ہیں ۔

۱۔ روپ بسنت ۔ ۲۔ دھنا جٹ ۔ ۳۔ پینڈو جٹی تے ساہوکار ۔ ۴۔ کرشن جنم۔ اور ۵۔ سیتا بن باس۔ جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے۔ داس مل نے سکھ اور ہندو دونوں موضوعات کو اپنے کارناموں میں استعمال کیا ہے۔ مولوی رحیم بخش، مثنوی "گل صنوبر" کے مصنف ہیں۔ کرتار سنگھ کومل نے 'ہیر رانجھا' لکھی تھی، جو چھپی نہیں۔

ان کارناموں کے ساتھ لوک گیتوں اور نظموں کا بھی کافی ذخیرہ پیدا ہوا۔ ان گیتوں اور نظموں کو ہمارے زمانے کے حسب ذیل مصنفین نے مجموعوں کی شکل میں اکٹھا کیا ہے :

۱۔ گیانی بدھ سنگھ نے پونچھ کے علاقے کے پنجابی گیتوں کو اکٹھا کیا ہے۔

۲۔ گیانی اوتار سنگھ شاد نے ریاست میں زبان زد لوک گیتوں کا ایک مجموعہ "پہاڑی گونجاں" کے نام سے مرتب اور شایع کیا ہے[۱]۔

۳۔ پروفیسر سیوا سنگھ، نے بھی ریاست میں پھیلے ہوئے گیتوں کا ایک مجموعہ اکٹھا کیا ہے جو ابھی شایع نہیں ہوا[۲]۔

۴۔ کنول کشمیری، ایک اور مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔

قدیم روایتی انداز کی شاعری میں استاد محمد اشرف نے مرثیہ لکھ کر

---

[۱] شاد صاحب کی سنہ ۱۹۶۹ء میں وفات ہو چکی ہے۔

[۲] یہ مجموعہ کلچرل اکیڈمی نے سنہ ۱۹۶۹ء میں شایع کیا۔

ایک نئے روپ سے کشمیر کی پنجابی شاعری کو روشناس کرایا۔ اشرف اڈی کے علاقے کے رہنے والے ہیں اور پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اشرف سے کئی جنبے تھے، جو کچھ عرصہ بعد وہ کلمہ مرتے گئے۔ اس کا انہیں جو قلق تھا، آخری لڑکا، شادی کے کچھ عرصہ بعد چل بسا۔ اس سانحے پر انہوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا ہے۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد سے نئی تعلیم اور مغربی ادب کے نئے نمونوں سے واقفیت کے نتیجے کے طور پر دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی ادب اور شاعری کے نئے نمونے پیدا ہونے لگے تھے لیکن ریاست کے پنجابی بولنے والوں تک نئی تحریکیں اس صدی کے ربع اول کے اواخر میں پہنچیں اور شعر میں فکر اور اسلوب کے انداز بدلنے لگے۔ حقیقت پسندی، واقعات نگاری اور اپنے اطراف کی زندگی، اس کے مسائل اور تحریکوں کو کشمیر کے پنجابی شاعروں نے اپنی فکر کا جزو بنانے کی کوشش کی۔ اس میں پنجاب کے لکھنے والوں کی کوششوں اور اُردو ادب میں پیدا تحریکوں سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ اور شاعری کو نیا لب و لہجہ عطا کرنے لگے۔ جدید دور میں شاعروں کی ایک اچھی خاصی تعداد منظر عام پر آئی جن میں ذیل کے سخنور خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ گیانی کرتار سنگھ کومل، سری نگر کے قریب نوجی پورہ کے رہنے والے ہیں اور سری نگر کے خالصہ اسکول میں پنجابی اور سکھ دینیات پڑھاتے ہیں۔ بابا گرو نانک کے عقاید کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا کلام "کومل ہلارے" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "کشمیر خالصہ ترنگنی" اور "قبایلی حملہ دا اتہاس" کی تصنیف میں وہ مشغول ہیں۔

۲۔ گیانی دلیپ سنگھ سُودن، "سودن سدھران" کے مصنف ہیں۔ ان کا وطن پونچھ ہے۔ ان کا انتقال سال ۱۹۷۵ء میں ہوا۔

(۹) کنول کشمیری، جن کا اصلی نام پرم جیت سنگھ بالی ہے، موضع اچھ ہامہ تحصیل بیروہ میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے اور تعلیم خالصہ ہائی سکول سری نگر میں حاصل کی۔ سکول کی تعلیم کے زمانے میں انہیں شعر کہنے کا شوق ہوا اور گیانی کرتار سنگھ اور پرتھوی ناتھ کھوڑ سے مشورہ کرتے رہے اور پروفیسر اوتار سنگھ اور پروفیسر عبدالرحمن راہی نے کالج کی تعلیم کے زمانے میں ان کی رہنمائی کی۔ پنجابی میں وہ لکھنے لگے اور کہانیوں کا ایک مجموعہ "کونپلاں" اور نظموں کا مجموعہ "جیون نوں جاندے راہ" شایع ہو چکا ہے۔ ایک طویل ڈراما "سمیں دے غازی" چھپا نہیں۔ اس پر انہیں اکادمی کا انعام بھی ملا۔

(۱۰) دیس راج دانش، تحصیل ہیرانگر کے موضع کھوٹا میں مقیم ہیں اور تجارت کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "ترنگاں" شایع ہو چکا ہے۔

(۱۱) جسونت سنگھ شان، جموں کے رہنے والے ہیں اور ایک سکول میں اُستاد ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "کچھ کویتا داں" چھپ چکا ہے۔

(۱۲) ترلوک سنگھ کا وطن بھی جموں ہے۔ بی۔ اے اور بی۔ ٹی پاس کر کے ایک سکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام کے مجموعے "نربل سدھراں" "نربل ترنگاں" کے نام سے مرتب اور شایع کئے ہیں۔

(۱۳) مایا کور نرمان، پنجابی کی خاتون شاعرہ جموں کی رہنے والی ہیں اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام "نرمان ساگر" کے نام سے جمع اور شایع کیا ہے۔

ان شعراء کے علاوہ کئی اچھے شاعر اور ایسے بھی ہیں، جن کا ذوق قابلِ تعریف ہے اور اپنے کلام کے مجموعے مرتب کر چکے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم سردار ہربنس سنگھ آزاد ہیں، جو ریاست کی تعلیمی، سماجی اور سیاسی زندگی میں

اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ موضع کھادنیار تحصیل بارہ مولہ میں پیدا ہوئے۔ سری نگر میں تعلیم پائی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے معاشیات وغیرہ میں ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ریاست کے سری پرتاپ کالج میں بحیثیت لیکچرار متعین ہوئے اور عرصہ تک معاشیات اور پنجابی زبان کے درس دیتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں جب ریاست میں نمائندہ اسمبلی قائم ہوئی تو ملازمت ترک کر کے، انتخابات میں حصّہ لیا اور اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے۔ اسمبلی کے سپیکر بھی کچھ عرصہ تک رہے۔ بعد میں وزیر بھی رہے۔ تعلیم کے علاوہ بعض اور محکموں کی وزارت ان کے سپرد رہی۔ اب "ویلج اینڈ کھادی انڈسٹریز" کے صدر ہیں۔

سردار آزاد شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور کلام کا مجموعہ اکٹھا کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کی کلچرل اکادمی کی فرمایش پر انہوں نے کشمیری شاعروں کے کارناموں کا ایک مجموعہ "چونویں کشمیری کویتا" کے نام سے مرتب کیا تھا، جو ۱۹۶۵ء میں شایع ہوا۔ ایک اور کارنامہ "پنجابی کویتا وِچ کشمیر" بھی انہوں نے مرتب کیا ہے۔ جو چھپ چکا ہے۔ سردار آزاد نے سنہ ۱۹۴۰ء میں جموں کے ڈاکٹر پریتم سنگھ پریتم بھی، جو طب کے ڈاکٹر ہیں، اپنے پیشے کے علاوہ پنجابی شاعری کا فطری ذوق رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا رجحان مذہبی اور سماجی ہے۔ ریاست کی پنجابی ساہت سبھا کے وہ سرپرست بھی رہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "پریتم کیاری دے کھڑدے پھُل" مرتب ہوا ہے۔[1]

کئی شاعر ایسے ہیں، جن کے مجموعے ابھی شایع نہیں ہو سکے۔ لیکن ان کی نظمیں رسالوں اور اخباروں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ان شعرا میں ڈاکٹر موہن سنگھ سیٹھی (سری نگر)، راجیندر کور بالی (بارہ مولہ)، ڈاکٹر رچھپال سنگھ (بارہ مولہ)

---

[1] ڈاکٹر صاحب کی سنہ ۱۹۶۰ء میں موت واقع ہو چکی ہے۔ سرداری صاحب کو شاید اس بات کا پتہ نہیں تھا۔

سمیر سنگھ ستانہ (بارہمولہ) ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ جس کا عنوان ہے "مست ٹکوراں"
اوتار سنگھ چندن (سری نگر) اور جموں کے ہرنام سنگھ (دکھیا) بھیم سین سیوک،
بشیر احمد بشیر، سنتوکھ سنگھ سنتوکھ، وید پال دیپ، دیو کمل دیو، جے دیو سنگھ وت،
رگھوبیر سنگھ مکت اور اوتار سنگھ تاری۔ پونچھ کے امریک سنگھ سکھی، درشن سنگھ
اکالی، ترال کے ڈاکٹر موہن سنگھ شانت، ان کی نظموں کا مجموعہ 'پنچھوں ہا سے'
چھپ چکا ہے اور جرنیل سنگھ گلاب اور کرگل کے رتن سنگھ رتن جن کی شاعری کا
مجموعہ 'ہنیرے چانن' چھپ چکا ہے، قابلِ ذکر ہیں۔

داس مل کے شاگردوں میں تارا چند بھی ریاست کے پنجابی شعراء میں اپنا
مقام رکھتے ہیں۔ وہ کانگریس کی آزادی کی جدوجہد سے بہت متاثر تھے اور
قومی رہنماؤں کی حمایت میں اور انگریزوں کے خلاف لکھا کرتے تھے۔ ان کی نظمیں
"دھن گاندھی تیری مایا" اور "جا انگریزا ایتھوں" عوام میں بہت مقبول رہیں۔
تارا چند نے شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ بھی پنجابی میں کیا تھا۔ ان کے شناساؤں
میں غلام محمد حیدر بھی پنجابی میں لکھتے تھے۔

سرجیت مہندر سنگھ نے ان دونوں کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک
دفعہ پنجاب کے کچھ شاعر جموں میں وشنو دیوی کی یاترا کے لئے آتے تھے۔ ایک
محفل شعر میں، پنجاب کے کسی شاعر نے جموں کے شاعروں پر کچھ ایراد کئے۔
تارا چند بھی محفل میں شریک تھے۔ انہوں نے فی البدیہہ جموں کی تعریف میں ایک
نظم کہی اور اسی وقت اسٹیج پر جا کر سنائی، جس کے بڑی داد دی گئی۔

غلام محمد خادم، اکالی کور سنگھ، بشن سنگھ کریٹ، بدھ سنگھ گیانی اور
میا سنگھ بھی اچھے سخن سنج ہیں۔ غلام محمد خادم کی نظمیں "سیر کشمیر"، "صبح کشمیر"
کے علاوہ "جموں دی رات" اچھی نظمیں ہیں۔ میا سنگھ کی سہ حرفیاں مقبول ہیں۔

اکالی کور ستنگھ تعلیم اور سماجی امور سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا وطن کشمیر ہے اور محلہ رعناواری میں ان کی آبائی جائداد تھی۔ بعد میں ان کا خاندان چکار میں منتقل ہو گیا تھا۔ تعلیم سے دلچسپی کی بدولت انہوں نے لڑکوں کے لئے ایک اقامت خانہ قائم کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ ان کو علمی کاموں سے بھی دلچسپی رہی، چنانچہ انہوں نے گرو گرنتھ صاحب میں واحد شلوک اور شبدوں کا ایک اشاریہ تیار کیا ہے۔ بشن سنگھ کریٹ، پونچھ کے رہنے والے ہیں۔ شاعری کے علاوہ انہیں تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی ہے۔ اُن کے کارنامے "جیون پھوہار" "نوری جھلکاں" "نوری جیون" مقبول ہیں۔ اُن کی شاعری میں فلسفہ اور اخلاق کے عناصر، انہیں دوسرے شاعروں سے ممیز کرتے ہیں۔ بشن سنگھ کریٹ کی زبان سادہ اور اسلوب سلیس ہوتا ہے۔

بُدھ سنگھ گیانی، پونچھ کے رہنے والے ہیں اور شاعری اور نثر نگاری دونوں میں انہیں یکساں مہارت ہے۔ اُن کی تصانیف میں "چودیں رتن" اور "گُچھے ہیرے" قابل ذکر ہیں۔ "گُچھے ہیرے" نظم و نثر کے انتخابات پر مشتمل ہے۔

جدید دور میں مغربی اصناف، ناول، افسانہ، اور ڈراما سے بھی کشمیر کا پنجابی ادب روشناس ہوا۔ اور کچھ اچھے ناول منظر عام پر آئے۔ ان میں ڈاکٹر رچھپال سنگھ، اُجاگر سنگھ بھنگ، سرن سنگھ، اور کنول کشمیری نے شاعری اور دوسرے اصناف کے علاوہ ناول کی طرف بھی توجہ کی۔ ڈاکٹر رچھپال سنگھ بارہ مولہ کے متوطن ہیں، علم انسانیات (انتھروپولوجی) میں انہوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی اور اس وقت ساگر یونیورسٹی میں اس مضمون کے پروفیسر ہیں۔ اُن کا ناول "پناڑیاں نال راں" چھپ چکا ہے۔ سرن سنگھ، کانہامہ، ضلع بارہ مولہ کے رہنے والے ہیں اور ریاست کے محکمہ جنگلات میں ڈی۔ ایف۔ او کے عہدہ پر مامور ہیں۔ انہوں نے بھی ایک ناول تصنیف کیا ہے۔

... گیانی ... میں ہوئی تھی۔

افسانہ نگاروں کی تعداد کشمیر کے پنجابی ادیبوں میں بھی، ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح قابل اعتنا ہے۔ کنول کشمیری کے افسانوں کے مجموعے "کونپلاں" کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "نیلا امبر چٹے تارے"، زیر طبع ہے۔ پروفیسر پریم سنگھ کا مجموعہ "نذرانے" شایع ہو چکا ہے۔ پریم سنگھ کی ولادت بڈگام کے ایک گاؤں ترزبگ میں ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ پنجابی میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی اور اس وقت امر سنگھ کالج میں پنجابی کے لیکچرار ہیں۔ سری نگر کی پنجابی ساہت سبھا کے وہ سرگرم کارکن ہیں اور کشمیر میں پنجابی کی ترقی کے لئے دل دہی سے کام کر رہے ہیں۔

پروفیسر دل جیت سنگھ، سری نگر کے ایک پنجابی خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ ریاست کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور اس وقت گورنمنٹ کالج کٹھوعہ میں پنجابی کے لیکچرار ہیں[1]۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "دُکی تکی پنچھی" مرتب اور شایع ہو چکا ہے۔ سرن سنگھ بھی اچھے افسانہ نگار ہیں اور اپنے افسانوں کا مجموعہ "بھلیکھے" شایع کر چکے ہیں۔ گورچرن سنگھ گلشن کے افسانوں کے دو مجموعے "کالیاں راتاں" اور "کلیاں" چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ سکھبیر کو[illegible]ینس کی کہانیوں کا مجموعہ اور پریتم سنگھ گیانی کا مجموعہ "اڈیک" منظر عام پر آچکے ہیں۔

پنجابی کے افسانہ نگار، دوسری زبانوں کے افسانہ نگاروں کے دوش بدوش افسانے کو نئے موضوعات اور نئے اسالیب سے روشناس کرانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانہ کو فنی اعتبار سے ترقی یافتہ زبانوں کے معیاروں تک بلند کرنے کی جد و جہد میں، وہ نئے نئے انداز سے کام لے رہے ہیں۔ ان کی مساعی کی بدولت، کشمیر کے پنجابی ادب میں، اس صنف ادب کا بڑا عمدہ ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے۔

---

[1] اس وقت وہ جموں یونی ورسٹی میں شعبہ پنجابی میں لیکچرار ہیں۔

ریاست میں پنجابی کی ترقی کے لئے دو ادارے پوری کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سری نگر کی پنجابی ساہت سبھا اور دوسری جموں (آر۔ ایس۔ پورہ) کی پنجابی ساہت سبھا ہے۔ ان دونوں اداروں کی جانب سے ریاست کے پنجابی لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس کی پیش رفت میں "کہانیوں کے دو مجموعے" جو مختلف کہانی کاروں کی تخلیقات پر مشتمل ہیں شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں سے سری نگر سے جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس کا نام "ولر دیاں چھلاں" اور جموں کی پنجابی ساہت سبھا کی جانب سے شائع شدہ مجموعے کا نام "درد دلاں دے" ہے۔ پنجابی ساہت سبھا سری نگر نے نکی نکی لو، افسانوں نظموں اور مقالات پر مبنی ایک مجموعہ چھپوایا ہے۔ اس کے علاوہ سبھا جنوری ۱۹۶۹ سے 'ہلیماں' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ شائع کر رہی ہے۔

شاعروں کی طرح بہت سے افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جن کے مجموعے ابھی شائع یا مرتب نہیں ہوئے۔ لیکن ان کی تخلیقات رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان میں پروفیسر سیوا سنگھ (جن کی کہانیوں کا مجموعہ "رشتے" زیر طبع ہے)، ڈاکٹر اندر سنگھ کنول، رچھپال سنگھ، نیتر سنگھ، پریتم سنگھ رین، جسونت سنگھ شان، وجے سُمن، راجیندر کور بالی، کوشلیا رینہ اور ام کیسن قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر سیوا سنگھ کے زیادہ اہم کارنامے تحقیق اور تنقید کے باب میں ہیں۔ ان کا کسی قدر تفصیلی ذکر اسی ضمن میں اور پھر اردو ادب میں بھی آ رہا ہے۔

ڈراما: ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح پنجابی ادب اور کشمیر کے پنجابی ادب میں بھی ایک نوخیز فن ہے۔ کچھ ادیب اب منظر عام پر آ رہے ہیں اور اس شعبہ ادب میں بھی اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ ان میں اُردو کے ماہر صحافت اور ڈراما نگار، وجے سُمن بھی ہیں، جو اُردو ہفتہ وار "چٹان" کے ایڈیٹر ہیں۔

وہ پنجابی کے کہانی کار بھی ہیں، ان کا تذکرہ اردو ادب میں بھی آرہا ہے۔ پنجابی میں انکا ڈراما "شانجھا مورچا" چھپ چکا ہے۔ اُجاگر سنگھ مہک کا "لاشاں دا ساگر" کنول کشمیری کا "سمیں دے غازی" اور پروفیسر نرہری رائے زادہ کا "پنجرا" شایع ہو چکے ہیں۔ رائے زادہ، جموں کے رہنے والے ہیں اور تعلیمی نفسیات میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اس وقت وہ مولانا آزاد میموریل کالج میں پروفیسر ہیں۔

ان مستقل ڈرامائی تصانیف سے ہٹ کر، وہ ادیب، جن کے مختصر یک منظری ڈرامے یا ایک انکی ناٹک رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں:
کنول کشمیری، نریندر کھجوریہ، ٹی، ایس، سوڈھی، سی پروانہ،
نریندر کھجوریہ، ڈوگری، اُردو اور پنجابی تینوں میں لکھتے ہیں۔ اُردو ادب کے حصے میں ان کا ذکر آیا ہے۔ وہ اور ان کے بھائی پروفیسر رام ناتھ شاستری، جموں کے نمایاں ادبی اشخاص میں سے ہیں۔ نریندر جی کلچرل اکادمی، جموں میں ڈوگری "شیرازہ" کے ایڈیٹر ہیں[1]۔ سوڈھی، ریڈیو کشمیر جموں میں برسر خدمت تھے۔ اب وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے ہیں۔ سی پروانہ بھی پنجابی کے علاوہ اُردو میں بھی لکھتے ہیں۔

تنقید و تحقیق

اس شعبہ ادب میں، کئی بالغ نظر ادیب کام کر رہے ہیں۔ ان میں پروفیسر سیوا سنگھ، جو سری پرتاپ کالج میں پنجابی کے پروفیسر رہیں۔ اپنی تحقیقی اور تنقیدی مساعی کے علاوہ، لسانی مطالعوں کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا وطن بھی بارہ مولہ ہے اور بارہ مولہ کی تحصیل کے گاؤں سنگھ پورہ کلاں میں، وہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی، پھر

[1] - نریندر کھجوریہ کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا تھا۔

سینٹ جوزف کالج بارہ مولہ سے بی۔ اے کیا۔ یہ کالج اب گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائینس کالج ہے۔ ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پنجابی میں ایم۔ اے۔ پاس کیا اور پھر بارہ مولہ کالج ہی میں پنجابی کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ اس وقت سری پرتاپ کالج میں پنجابی کے پروفیسر ہیں۔

سردار سیوا سنگھ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین رسالہ "شیرازہ" اردو میں چھپتے رہتے ہیں۔ "کشمیر میں پنجابی زبان اور ادب" کے عنوان سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۶۸ء میں شایع ہوا ہے۔ اس کے موضوعات سے جو یہاں درج ہیں۔ ان کے پنجابی زبان اور ادب اور کشمیری اور پنجابی کے تقابلی مطالعے کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

۱۔ ریاست جموں و کشمیر میں پنجابی لوک گیت (۲) کشمیر میں پنجابی محاورات اور کہاوتیں (۳) پرمانند کی شاعری پر گوربانی اور پنجابی زبان کا اثر (۴) کشمیری زبان میں قصہ سوہنی مہیوال۔ (۵) ریاست جموں و کشمیر میں پنجابی زبان۔

وہ اس وقت ریاست میں پنجابی زبان اور ادب کی ایک مربوط تاریخ بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کے کچھ تحقیقی اور تنقیدی مضامین، پنجابی ساہت سبھا، سری نگر کی جانب سے شایع کئے ہوئے مجموعے "نکی نکی لو" میں شایع ہوئے ہیں۔ جسے سردار جی ہی نے مرتب کیا ہے اور یہ مجموعہ ۱۹۶۶ء میں شایع ہوا ہے۔ کچھ مضامین اور مقالے کلچرل اکادمی، سری نگر کے مجموعے "ساڈا ساہت" میں بھی چھپتے رہے ہیں۔

ریاست کی کلچرل اکادمی، ریاست کی اور زبانوں کے ساتھ، پنجابی زبان اور ادب کے کارناموں کی اشاعت میں قرار واقعی مدد کر رہی ہے۔ ہر سال کی بہترین کتابوں پر انعامات کے علاوہ پنجابی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو

شایع کرنے کے مقصد سے، رقمی امداد عطا کر کے بھی مدد کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ منتخب پنجابی ادب کے حسب ذیل مجموعے، خود اکادمی کی جانب سے شایع ہوئے ہیں:

(۱) چونواں پنجابی ساہت (۱۹۶۴ء) ۔ (۲) ساڈا ساہت (۱۹۶۵ء)
(۳) ساڈا ساہت (۱۹۶۶ء) (۴) چونوی ڈوگری کویتا (پنجابی میں ۶۸-۱۹۶۷ء)
(۵) چونویں کشمیری کویتا (پنجابی میں) ۱۹۶۵ء ۔ (۶) ساڈا ساہت (۱۹۶۷ء)۔
(۷) ڈوگری کشمیری کہانیاں (ڈوگری کہانیاں گورمکھی میں اور کشمیری کا ترجمہ ۶۹-۱۹۶۸ء)[1]

حکومت پنجابی کی، ایک اقلیتی زبان کی حیثیت سے، حتی الامکان سرپرستی کر رہی ہے اور کشمیری زبان اور ادب کی تعلیم اور اس کی ترقی کے سلسلے میں جو انتظامات کئے گئے ہیں وہ کشمیر کی رواداری کی روایات اور ان کی نگہداشت اقلیتی زبان اور ان کی تہذیب کے تحفظ کی ایسی مثال ہے، جو دوسری ریاستوں کے لئے نمونہ بن سکتی ہے۔

---

[1] کتابیں شایع کرنے کے علاوہ اکادمی ۱۹۶۶ء سے پنجابی میں بھی "شیرازہ" شایع کر رہی ہے۔ جس کو ۱۹۸۰ء سے دوماہی کر دیا گیا ہے۔ شری امریک سنگھ اس کے ایڈیٹر ہیں۔ پنجابی حلقوں میں اس رسالہ کو کافی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

گوجری زبان اور ادب

گوجری زبان، ان خانہ بدوش گوجر قبیلوں کی زبان ہے، جو زمانہ قدیم میں کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں ہندوستان سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر قبیلے اب بھی خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ گوجر زمانہ قدیم میں شمال مغرب کی طرف سے، ہندوستان آئے تھے اور سنہ ۴ء تا ۶۰۰ء کے درمیان پنجاب سے لے کر جنوب کی طرف پھیل چکے تھے اور خاندیس اور گجرات تک پہنچ گئے تھے، جہاں انہوں نے اپنی حکومت قایم کی اور تہذیب اور شائستگی کی روایات کو بھی نشو ونما دیا۔

سر جارج گریرسن کا کہنا ہے کہ جاٹ قوم بھی جو ان کے بھائی بند ہوتے ہیں۔ تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان آئے۔ لیکن وہ زیادہ تر اُتر پردیش اور آس پاس کے علاقوں تک محدود رہ گئے۔ گوجروں کی ابتدائی آبادیاں، اُتر پردیش اور سندھ سے لے کر متھرا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قرین یہ ہے کہ متھرا سے آگے بڑھتے ہوئے یہ مشرقی راجپوتانہ تک پہنچ گئے اور وہاں سے مالوہ گئے اور مالوہ سے بھلاسا اور سہارنپور تک بھی ان کا پھیلاؤ ہو گیا۔

گوجر مورخین نے لکھا ہے کہ اکبر کے عہد میں، مغل اور راجپوت فوجوں نے

جب ان پر پے در پے حملے کر کے انہیں شکست دے دی، تو یہ شمال کی طرف چلے گئے۔
اور ہمالیہ کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ پنجاب میں قیام کے زمانے میں انہوں نے جو شہر
بسائے تھے۔ ان میں گجرات اور گوجرانوالہ اب تک ان کی یادگاریں موجود ہیں۔ اپنے
عروج کے زمانے میں گوجروں کی بڑی تنظیم اور بلند حوصلے تھے۔ پنجاب سے جب یہ آگے
بڑھے تو کئی علاقوں کو مسخر کر لیا۔ موجودہ گجرات جو دراصل "گوجر" اور "راشٹر"
یعنی گوجروں کا ملک تھا۔ ان کا بڑا مرکز تھا۔

"گوجر دیس" (جموں) ہفتہ وار میں ایک گوجر مصنف کی تصنیف سے اس
قوم کی قدامت کے بارے میں کچھ اقتباسات دئیے گئے ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے کہ
یہ ہندوستان کی قدیم قوم ہے، اور اس کا تذکرہ بھاگوت پران میں بھی آیا ہے۔ اس
قوم کا ایک گروہ سری کرشن جی کی قیادت میں متھرا سے ہجرت کر کے دوارکا میں آباد
ہو گیا تھا۔ جہاں ان کی حکومت ہزاروں سال تک رہی۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ گوجر راشٹر
(گوجر راشٹر) کہلایا۔ ۶۴۰ء میں چینی سیاح ہیون سانگ جب ہندوستان آیا تھا
اس زمانے میں گجرات کے علاوہ راجستھان اور سندھ پر بھی گوجروں کی حکومت
تھی۔ ہیون سانگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ گوجر مملکت میں اونٹ بہت پائے جاتے
ہیں، جس سے اس کا مطلب راجستھان اور سندھ تھا۔

ذیل کی مزید معلومات کے۔ ایم۔ منشی کی تصنیف "ہسٹوری آف گجر دیش"
سے مذکورہ بالا اخبار میں شایع ہوئی تھیں۔

"انڈونیشیا کا جزیرہ سماٹرا، ہندوستان کی ایک نوآبادی تھی اور
اس کا نام سورن پربت تھا۔ یہ نوآبادی، مالوہ (مدھیہ پردیش)
کے گوجروں نے قایم کی تھی۔"

اور یہ بھی کہ گوجر سمندر پار کر کے انڈونیشیا تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستانی گوجروں نے

ملک سے باہر کمبوڈیا کے شمال میں پہلی صدی عیسوی میں ایک نو آبادی قائم کی۔ اس کی راجدھانی کا نام امراوتی تھا۔ یہاں گوجروں نے پندرہویں صدی تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس کے بعد یہاں ان کی حکومت ختم ہوگئی اور سماٹرا کے گوجروں کی طرح اس نو آبادی کے گوجروں نے بھی اسلام قبول کرلیا اور یہاں کے سب باشندے اب مسلمان ہیں۔

"ہند قدیم" کے مصنف نے چھٹی صدی عیسوی کو گوجروں کے عروج کی صدی سے موسوم کیا ہے اور ماتو مدار کا بیان ہے کہ جودھ پور سے اراولی پربت تک گوجروں کی حکومت تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب گوجروں کا تازہ دم قافلہ پنجاب میں اپنے پیچھے شہروں کے نام گوجر خان اور گوجرانوالہ چھوڑ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ جودھ پور سے اراولی پربت تک گوجر ایک آزاد مملکت کے فرمانروا تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے کشمیر پر حملے کے وقت گوجر قوم کشمیر کی سرحدوں پر آباد تھی۔ اور یہی لوگ محمود کے حملے میں سینہ سپر ہوئے اور اس کی فوجوں کو آگے بڑھنے سے روکا۔ گوجر سردار ... جے پال کٹھانہ کے ہاتھوں محمود کو بُری طرح شکست کھانی پڑی۔ جس سے کشمیر کی طرف اس کی پیش قدمی رُک گئی۔

گوجروں کا زوال تیرھویں صدی سے شروع ہوا۔ پھر اکبر کے عہد میں راجپوت سرداروں سے اس کے اتحاد کے بعد، مہارانا مان سنگھ کی سرکردگی میں، مغل فوجوں نے گوجروں کو گجرات، اور دوسرے حصوں میں شکستوں پر شکستیں دیں، جس کے بعد وہ سنبھل نہ سکے۔ اور شہروں کو چھوڑ چھوڑ کر پناہ لینے کے لئے پہاڑوں کی طرف چلے گئے۔ چنانچہ نیپال کی ترائی سے لے کر کشمیر کے پہاڑوں اور بھدرواہ تک گوجروں کے بہت سے قبیلے موجود ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں گوجروں نے انگریزوں کے خلاف سب سے

پہلے میرٹھ میں بغاوت کی تھی لیکن بہادر شاہ کے طرفداروں کی تنظیم میں انتشار کے سبب یہ جنگ شکست سے بدل گئی۔ اور گوجر سردار انگریزوں کے استبداد کا نشانہ بنے۔ ۱۸۴۶ء میں، مہاراجہ گلاب سنگھ نے معاہدہ امرتسر کے تحت کشمیر کو خرید کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، تو پونچھ کے گوجر سرداروں نے، اس کی مقاومت کی۔ گوجروں کے سردار شمس الدین اور اس کا بھتیجا تھے، جنھوں نے گلاب سنگھ کی فوج کو بار بار شکست دی۔ اور جموں سے ان کے خلاف کمک بھی بھیجی جاتی رہی۔ آخر گلاب سنگھ نے اپنی حکمت عملی سے ایک راجپوت سردار محمد خان کو روپیہ کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ محمد خان نے چچا اور بھتیجے کو شادی کی دعوت کے بہانے اپنے گھر بُلا کر قتل کر دیا۔ اس حادثے پر گوجری میں کچھ مرثیے لکھے گئے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد گوجر قوم کا بھی بٹوارہ ہو گیا، لیکن ان کی زبان ان کے ساتھ رہی۔ جموں میں اس وقت بھی گوجروں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ لیکن جب سے وہ پہاڑوں کی طرف چلے گئے اور شہری زندگی ترک کر دی، بادیہ گردی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

گریرسن نے گوجر زبان کا تذکرہ الگ نہیں کیا بلکہ گجراتی کے تحت، گوجروں کی قدیم تاریخ کا خاکہ درج کیا ہے۔ خود گوجر مصنفین، اپنی زبان کو راجستھانی کی شاخ بتاتے ہیں۔ چنانچہ "گوجر دیس" (۲۴، اگست ۱۹۶۸ء) سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

"اس کا منبع اگرچہ راجستھانی زبان ہے، لیکن اس کے بولنے والے زیادہ تعداد میں راجستھان سے باہر آباد ہیں۔ گوجروں نے اپنے مرکز راجستھان اور گجرات سے نکل کر برصغیر ہند و پاک اور دیگر ملکوں میں اپنی بستیاں بسائیں اور نو آبادیاں قائم کیں۔ یہ لوگ جہاں

بھی گئے، اپنی زبان ساتھ لیتے گئے اور اسے قائم رکھا۔"

گریرسن کا مطالعہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ جن جن مقامات میں گوجر لوگ گئے، اگر وہ مقامی آبادی میں ضم نہیں ہو گئے تو اپنی زبان کو برقرار رکھا اور جہاں بھی وہ رہیں، ایک ہی زبان کی بولیاں بولتے سنائی دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ سوات کے گوجروں کی زبان کی قواعد تقریباً وہی ہے، جو جے پور کے راجپوتوں کی زبان کی ہے۔

گوجری زبان، جموں اور کشمیر میں بولی جانے والی سبھی زبانوں میں قواعد کے لحاظ سے اُردو سے بہت قریب ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑی حد تک اُردو کا سا ہے یا اُردو کے متجانس لفظوں کا۔ اس میں جو ادب اب پیدا ہو رہا ہے، اس پر بھی اُردو کا اثر ہے، لیکن گوجری اور اُردو میں ایک اہم بنیادی فرق یہ ہے کہ یہ "او" اساس والی زبانوں میں شامل ہے۔ جس کی دوسری زبانیں، برج بھاشا، قنوجی، راجستھانی ہیں۔ ان زبانوں کے اسماء، ضمائر اور بعض افعال کے آخر میں اُردو کی علامت "اُ" کی جگہ "او" آتی ہے۔ جیسے

مہارو ، تھارو

یہ ضمیریں بھی راجستھانی سے مستعار ہیں۔

گوجر قوم کے اس شاندار ماضی کو پس منظر میں رکھتے ہوئے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گوجری زبان کے ادب کے بہت کم آثار ملتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کے ادب کے ارتقاء کی کڑیاں بھی بکھری ہوئی ہیں تو استعجاب ہوتا ہے کہ اس قوم میں ادبی اظہاروں کا ارتقاء کیوں مفقود ہے۔ محمد اسماعیل ذبیح نے جن کا تذکرہ آگے آ رہا ہے، اپنے کلام کے مجموعے "یادِ وطن" کے دیباچہ میں جب یہ وضاحت کی ہے کہ گوجری میں ان کے کلام کا مجموعہ جو ۱۹۶۵ء میں منظر عام پر آیا، گوجری

زبان میں سلسلۂ تصنیف و تالیف کا حرفِ آغاز ہے تو ہم کو اچنبھا سا ہوتا ہے لیکن
اس کا یہ مطلب نہیں کہ سنہ ۱۹۶۵ء سے قبل گوجری میں کچھ ادب پیدا ہی نہیں ہوا۔
بلکہ جدید عہد میں تصنیف و تالیف کا یہ آغاز ہے۔ اس سے پہلے جو ادب پیدا ہوا،
وہ اب لوک ادب میں شمار ہوتا ہے اور اسے قلمبند ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔
کچھ رسالے اور نظمیں جو لکھی گئی ہیں، وہ منظرِ عام پر نہیں آسکے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل کا جو عہد تھا
اس وقت تک گوجر قوم اپنی سالمیت کھو چکی تھی اور مغلیہ حکومت کی دار و گیر
سے بچنے کے لئے ان لوگوں کو پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔
اور اس طرح کے ماحول میں رہتے ہوئے، ان کو زندگی کے وہ طور طریقے اختیار کرنے
اور ذریعہ معاش کے وہ وسیلے ڈھونڈنے پڑے جو مقام کی نوعیت کا تقاضا تھے۔
گوجر قوم کی زندگی بحثیت مجموعی اس مرحلے سے اب تک قدم آگے نہیں بڑھا سکی۔

میاں جاوید نظامی اپنے مختصر مضمون "زبان تہذیبوں کا سنگم" میں جو رسالہ
"گوجر دیس" میں شائع ہوا تھا۔ "ہماری قوم کے پاس اپنی زبان میں با افراط
لٹریچر" نہ ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے، اس کی شکایت کرتے ہیں کہ گوجروں اور
ان کی زبان کے ساتھ بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ جہاں تک قدیم ادب کا تعلق
ہے، گوجر مصنفین 'میرا بائی' کی زبان کو گوجری ہی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم اردو
کے مصنفین، اپنی زبان کو گوجری، دکھنی اور ہندی تینوں ناموں سے یاد کرتے
ہیں۔ "گوجر دیس" کے مرتب اور ایڈیٹر اقبال عظیم نے آٹھویں صدی عیسوی کی
گوجری شاعری کے کچھ نمونے رسالے میں دیئے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں:

تھارو بیس بگڑیو ناریل — تھاری آنکھ ملبو کی پھانک
تھاری ناک سواں کی چونچ — تھارا ہتھ چمپا کی ڈال

دسویں صدی سے لےکر بارہویں صدی تک جب گوجر اقتدار کے مراکز دہلی اور قنوج تھے، اس زمانے کی شاعری کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے۔

او گوجر مہارو مندر دیکھن آئیو!

دیوی جی تھارا مندر کو کاہیں دیکھن

اکبر کے عہد تک گوجروں کے دوسری زبانوں خاص طور پر فارسی بولنے والوں کے ساتھ میل ملاپ کے نتیجے کے طور پر کئی لفظ فارسی کے ان کی زبان میں داخل ہو گئے تھے اس کی ایک مثال یہ ہے۔

مہاری بیٹی تہار محلاں کی پٹڑی ہم باندے غلام رے

تہاری بیٹی مہار محلاں کی رانی تم صاحب سردار وہے رے

گوجر مصنفین نے لکھا ہے کہ سنت کبیر داس نے بھی کچھ دوہے گوجری میں لکھے تھے۔ اس کی مثال یہ دی ہے۔

چن چن ماٹی گھر بنایو مورکھ کہے گھر میرو آے

نہ گھر تیرو نہ گھر میرو چڑیاں رین بسیرو اے

اٹھارویں صدی کے آغاز میں، گوجری زبان شاعری کے علاوہ نثر میں بھی استعمال ہونے لگی تھی جس کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے:

"مہارا ٹیکا گوجرات کاٹھیاوار تے آیا تھا، گوجرات (پنجاب) ہم نے اکبر تے مُل لیو تھو گوجر لوک پنجاب کا میدان تے پہاڑاں کی چوٹیاں پر بسیں تیرو بھائی کیھاں گیو۔"

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز تک پونچھ کے گوجروں کی زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ کئی گوجر شعراء اپنی زبان کو شعر و ادب کا واسطہ بنانے اور اس کو سنوارنے میں مصروف تھے۔ ان میں سید قادر شاہ پونچھی

نوّن پونچھو، سائیں قادر بخش پونچھی کا کلام دستیاب ہو جاتا ہے۔

سید قادر شاہ، گوجری کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے، لیکن اب ان کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ ان کی سی حرفی کے صرف چند بند ملتے ہیں:

نوّن پونچھی کا نام مہر علی تھا۔ ان کے بارے میں "گوجر دیس" (جنوری ۱۹۶۵ء) میں ایک مختصر سا نوٹ شائع ہوا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام چھپا ہوا نہیں ملتا بلکہ اکثر لوگوں کے زبان زد ہے۔ ان کا ایک قطعہ "آہیسین" اور انکی سی حرفی سے دو بند مذکورہ بالا رسالہ میں طبع ہوئے ہیں۔ جن میں ایک بند حسب ذیل ہے:

ق۔ قید ہوئی غم گا پنجرا ماں کری دکھاں نیں جاں لاچار الیسوں
ہو یو جبین شکل کھان میں بھلیو، کتے نیئں تھا تو دلدار الیسوں
نہیں تھی خبر پریت ماں یہ دھوکھا بسر گیو متاں گھر بار الیسوں
نوّن زلفاں گو کھیل کمند گل ماں مناں سٹو سر گے بھار الیسوں

سی حرفی کی صنف گوجری اور پنجابی میں بہت مقبول تھی۔ اور اکثر شاعر اس میں طبع آزمائی ضروری سمجھتے تھے۔ اس میں ابجد کے تیس حروف میں سے ہر حرف کو سر حرف بنا کر چار چار مصرعے موزوں کئے جاتے ہیں۔ نوّن پہاڑی پنجابی بولی میں بھی لکھتے تھے۔ اصل میں گوجروں کی پہاڑوں میں بود و باش کی وجہ سے وہ پہاڑی پنجابی سے اکثر ربط میں آتے اور گوجری اور پہاڑی پنجابی کے اثرات ایک دوسرے سے قبول کرتے تھے۔ پہاڑی پنجابی اپنے ادبی روپ کے لئے ہمیشہ ادبی پنجابی کی طرف نگراں رہتی ہے۔ اس لئے پنجابی اور گوجری بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوئی ہیں۔ بعض وقت زبان کے باریک فرق پر نظر رکھنے والوں کے سوا، گوجری

اور پنجابی کے گیتوں میں لوگوں کو فرق کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ایک زبان کے گیت یا شعری نمونے دوسری زبان سے منسوب ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ گوجری کے گیتوں اور نظموں کے تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے، اس کے الفاظ کے مخصوص روپ کو پنجابی کے بولنے والے اپنی زبان کے روپ میں تبدیل کر سکتے ہیں، جو ایک فطری رجحان ہے۔ میاں محمد زماں بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی سی حرفی پنجابی میں ملتی ہے۔

گوجری شاعری کی اصناف میں، سی حرفی کے علاوہ، غزل، قطعہ، مثنوی، اور نظم ساری اصناف کے نمونے ملتے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے حمد اور نعت پر بھی کافی لکھا گیا ہے۔ وسیم اختر نے اپنے مضمون "گوجری زبان و ادب" (شیرازہ، شمارہ ستمبر ۱۹۶۴ء) میں گوجری مثنویوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ یہ ذخیرہ مطبوعہ نہ ہونے کی وجہ سے، ہر پڑھنے والے اور پڑھنے کے خواہش مند کی دسترس میں نہیں۔ اختر اگر اہم مثنویوں کے نام دے سکتے تو مفید ہوتا۔ ایک مثنوی کے، جس کے مصنف کا نام بھی انہوں نے نہیں بتایا، یہ چند شعر نمونے کے طور پر نقل کئے ہیں[۶]۔

چل قلم کر کے، نام رب کو یاد — جس کی قدرت تے ہے جہاں آباد

سارو ہی جگ جہاں ہے اس کو — یاہ زمیں یوہ آسمانی ہے اس کو

اس نا مِتھ ماں یِہ ہے زندگی ہماری — اس نیچے آگے ہے بندگی ہماری

وسیم اختر نے یہ بھی لکھا ہے کہ "گوجری زبان لوک گیتوں کی دولت سے مالا مال ہے"

اور زبان اس وقت بھی جس مرحلے میں ہے۔ اس بارے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ گیت کئی عنوان کے تحت کہے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیل، وسیم اختر سے ماخوذ حسب ذیل ہے:

(۱) مقدم نورا (۲) اُڈّ تو کاگ تے پردیسی (۳) اُچّی ماہلی تے ڈھول (۴) سپاہیا جی (۵) میر وچن (۶) سجنا بہلو مڑے (۷) گوجری ماہیا (۸) او بیساکھا۔ (۹) مقدم تاجہ (۱۰) بریا گوجر غوراج (۱۱) اچونکو تے سپاہیا جی۔

سائیں قادر بخش پونچھی مرحوم درویش منش اور لا اُبالی طبیعت کے انسان تھے۔ وہ عشق و محبت کے راگ گاتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ ان کی سی حرفی بہت مقبول ہے۔ وسیم اختر لکھتے ہیں۔

"اس میں محبت کی تمام تشنہ آرزوئیں، محبوب کو پانے کی ازلی اور ابدی خواہش اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ نمایاں ہے۔ استعاروں اور تشبیہوں کا خوبصورت استعمال، احساس کی کیف سامانی، تخیّل کی ندرت اور جذبہ کی گہرائی و گیرائی ذہن پر ایک غمناک تاثر چھوڑتی ہے۔"

سائیں کی شاعری میں امیر خسرو کے کلام کی کیفیت ملتی ہے۔ گوجری کے علاوہ ڈوگری اور پنجابی میں بھی ان کے گیت، نظمیں اور رباعیاں لکھی گئی ہیں۔ ان کی یہ عادت تھی کہ اپنے ساتھ ایک بانسری لئے رہتے اور اپنے گیت بانسری پر گا کر سنایا کرتے تھے۔ ان کی سی حرفی کے کچھ بند "گوجر دیس" کے شمارہ مارچ ۱۹۶۷ء میں شایع ہوئے ہیں۔

خدا بخش زار بھی، جو سائیں قادر بخش کے کچھ بعد گذرے ہیں، اچھے سخن سنج تھے۔ وہ پونچھ کے رہنے والے تھے اور گوجری کے علاوہ پنجابی اور اردو میں بھی شعر

کہتے تھے۔ ان کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ کچھ اجزاء "گوجر دلیس" کے اڈیٹر نے تلاش کرکے نکالے تھے، جن میں سے ایک، چومصرعہ قطعہ، اور ایک قطعہ جس کا عنوان ہے "تیرو کے گھاٹو" رسالے میں (شمارہ مارچ ۱۹۶۵ء) شایع کئے ہیں۔ خدا بخش نے کچھ بارہ ماسے بھی لکھے تھے۔

سلطان المشایخ حضرت عبیداللہ المعروف باباجی لاروی، مذہبی پیشوا، اور خوش فکر صوفی شاعر تھے۔ آپ کی کچھ سی حرفیاں جو پوٹھوہاری میں ہیں دستیاب ہوتی ہیں۔

حضرت میاں محمد بخش جو کھڑی شریف کے رہنے والے تھے، روحانی بزرگ تھے، آپ کا شعروسخن کا مذاق بھی پاکیزہ تھا۔ آپ کا کارنامہ "سیف الملوک" جو ایک عشقیہ مثنوی ہے، متصوفانہ پہلو بھی رکھتی ہے۔ اس کا اثر بعد کے لکھنے والوں پر بہت پڑا تھا۔

میاں نظام الدین لاروی، حضرت عبیداللہؒ کے سجادہ نشین اور دینی پیشوا ہیں۔ شعروسخن کا بھی اچھا مذاق رکھتے ہیں اور حضرت عبیداللہؒ سے اس ذوق میں مستفید ہیں۔ سائیں قادر بخش کا بھی ان پر اثر ہے۔ جن سے میاں صاحب نے اصلاح بھی لی ہے۔ آپ کا کچھ کلام "کوہسار ٹائمز" (۵۔ اگست ۱۹۶۹ء) میں شایع ہوا ہے۔

جس زمانے میں ریاست میں آزادی کی جدوجہد برپا تھی، کئی گوجر رہنما بھی اسی جذبے سے سرشار تھے۔ ان میں چوہدری غلام حسین اور خاص طور پر ان کے فرزند چوہدری محمد اسلم کسانہ، جو گوجر گاندھی کے لقب سے مشہور ہیں، ریاست کے عوام اور گوجروں میں بیداری پیدا کرنے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ انہوں نے اور میاں نظام الدین لاروی نے گوجروں میں تنظیم، سماجی اصلاح اور نوجوانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ قوم کے ہونہار نوجوانوں کے لئے سکول قایم کئے اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند روانہ کرنے کا بھی انتظام کیا۔ انہیں

ہمدردوں میں چوہدری دیوان علی خان کھٹانہ بھی شامل ہیں، وہ ذی اثر شخصیت کے مالک ہیں اور علم و ادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے کچھ مضامین بھی قومی اصلاح، تنظیم اور گوجر تاریخ پر رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔

ہمارے زمانے کے سیاسی رہنماؤں اور سماجی مصلحین میں چوہدری محمد شفیع کھٹانہ قابل ذکر ہیں، جو گوجر قوم کی ترقی، اصلاح اور تعلیم کی مساعی میں سرگرم ہیں۔ چوہدری صاحب ضلع اننت ناگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد حاجی محمد اسماعیل کھٹانہ کا شمار بھی ریاست کے معتبر لوگوں میں ہوتا ہے ریاست میں چوہدری محمد شفیع عرصہ سے ہیں۔ وہ مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے تھے لیجسلیٹو کونسل کے ڈپٹی چیئرمین بھی رہے۔ اس وقت وہ ریاست کے نایب وزیر ہیں۔ علم و ادب سے انہیں گہرا لگاؤ ہے، چنانچہ ان کے مضامین رسالوں اور اخباروں میں چھپے ہیں۔ ایک مضمون جو "گوجری زبان اور ادب" کے عنوان سے "گوجر دیس" میں شایع ہوا تھا۔ گوجری ادب کے بارے میں جاننے کے خواہش مندوں کے لئے اچھا مطالعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

دوسرے ہمدردان قوم میں، جن میں سے کئی چوہدری محمد شفیع کے رفقائے کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چوہدری بلند خان ریاسی، وزیر محمد ہکلہ پونچھی، چوہدری گلزار احمد ایم۔ ایل۔ سی، جو چوہدری دیوان علی کھٹانہ کے صاحب زادے ہیں، سیاست کی دلچسپیوں کے علاوہ علم و ادب سے بھی شغف رکھتے ہیں، چوہدری نور محمد ایم۔ ایل۔ سی، جو کشتواڑ کے متوطن ہیں۔ میاں نظام الدین کے فرزند میاں بشیر احمد لاروی ایم۔ ایل۔ اے، چوہدری گلزار احمد۔ چوہدری شریف طارق، چوہدری فتح محمد درسو، جو متمول اور ذی اثر ہیں، چوہدری عبدالرشید ساوی پونچھ، چوہدری خورشید عالم، جموں، چوہدری بشیر احمد کھٹانہ۔ راجوری، چوہدری سید محمد شیندرہ

جن کا چوہدری محمد اسلم لساؤی سے ہم رشتہ ہیں، سیاست، سماجی اصلاح، ترقی تعلیم اور علم و ادب کی ہمت افزائی میں اپنا اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ "گوجر دیس" اور گوجروں کی بھلائی سے متعلق تحریکات میں ان کا تعاون اور ان کی مدد بھی شامل رہتی ہے۔

عہدِ جدید میں خاص طور پر آزادی کے حصول کے بعد ریاست کے مختلف لسانی گروہوں کے ساتھ ساتھ گوجر اہلِ علم حضرات میں اپنے اسلاف کے علمی اور ادبی کارناموں کی کھوج کر کے انہیں منظرِ عام پر لانے اور قدیم تاریخ کو مدون کرنے سے فطری جذبہ اُبھر رہا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان، اُردو، پنجابی اور ڈوگری کے ساتھ ساتھ، گوجری کو ادبی اظہارات کے لئے برتنے اور نئے اصناف سے اُسے روشناس کرانے کا احساس بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ان میں فتح علی سروری کسانہ۔ مولوی محمد اسماعیل ذبیح، اقبال عظیم وغیرہ پیش پیش ہیں۔

فتح علی جموں کے صاحبِ ذوق ادیبوں اور اہلِ صحافت میں سے ہیں۔ قوم میں تنظیم اور بیداری پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اخبار "نوائے قوم" جاری کیا۔ "گوجر دیس" کی بھی سرپرستی کی اور اس کے مہتمم کے فرائض انجام دیئے۔ اس وقت، "گوجر ادب" کی تصنیف کے کام میں مصروف ہیں۔

محمد اسماعیل ذبیح، گوجری کے سر برآوردہ شاعروں میں سے ہیں۔ اور گوجر قوم اور گوجری ادب کی ترقی کی سعی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے، ایک ۱۹۶۵ء میں اور دوسرا ۱۹۶۸ء میں "یادِ وطن" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ جو اُردو میں لکھا ہے۔ وہ "گوجر دیس" میں "گوجر اور خدا کا قانون مکافات" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ دیباچہ میں وہ گوجر قوم کے سیاسی تنزل پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ دیباچہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں معاصر تصانیف کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اطلاع بھی دی ہے

کہ فتح علی سروری کسانہ، محمد اسرائیل اثر، اسمٰعیل نظامی اور اقبال عظیم گوجر شعرار کا منتخب کلام " گوجر ادب " کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ ذبیح گوجری کے علاوہ، اُردو فارسی اور پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کی ایک سی حرفی " گوجر دلیس " کے شمارہ جنوری ۱۹۶۵ء میں شایع ہوئی ہے۔ جس کے بند الف کا پہلا مصرع ہے۔

میرا یار نال میرو پیام دے آ   قاصد اللہ کو واسطو جا

ذبیح کے چھوٹے بھائی، محمد اسرائیل مہجور بھی شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے ہیں ان کے کلام کے دو مجموعے " پیغام آزادی " اور " گوجری لوک گیت " شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کئی اور منظومات بھی ہیں جو ابھی تک شایع نہیں ہوئیں۔ ان کے گیت اور نظمیں " سپاہیا جی " " میرو چمن " " گوجر دلیس " کے مختلف شماروں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔

محمد اسرائیل اثر، ایک اور اہم شاعر ہیں، جن کا وطن وانگت ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء کے قریب پیدا ہوئے اور تعلیم ختم کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور جموں کے ایک سکول میں مدرس ہیں۔ شاعری کا شوق زمانہ طالب علمی سے رہا اور اب تک غزلوں، گیتوں رباعیات اور نظموں کا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے، جس کے شایع ہونے کا موقع نہیں آیا۔ ان کی نظمیں اور گیت اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ " گوجر دلیس " میں کئی گیت شایع ہو چکے ہیں۔ جن میں " ہولیں ہولیں بول رے پنچھی " اچھا رومانی غنائی گیت ہے۔ اثر گوجری کے علاوہ اُردو اور پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں۔

محمد اسرائیل مہجورؔ کا وطن راجوری ہے، یہ بھی کئی گیتوں اور نظموں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک اچھی نظم " سپاہیاجی " " گوجر دلیس " کے شمارہ جنوری ۱۹۶۸ء میں شایع ہوئی ہے۔ وہ نثر بھی خوب لکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک خط بھی جو اسی رسالے کے ایک شمارہ میں شایع ہوا ہے، موجودہ دور میں گوجری نثر کا نمونہ ہے۔

نذیر احمد فدا، گوجری کے مقبول شاعروں میں سے ہیں۔ کلام میں مزاح کا عنصر ہوتا ہے۔ یہ عموماً گرمیوں میں کشمیر چلے آتے تھے۔ ایک سال اس کا موقع نہ ملا تو اپنے ایک دوست اکبر کو کشمیر منظوم خط لکھا تھا، جس کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

تم نے جا کے خط نہیں لکھا گلو شکوہ مہارو ہے
اپنی جان سکھلی لوائے کس ناں کوں ناپیار وہے
چھوڑ گیا پھر یاد نہیں آیا سب قصور یو تھارو ہے
ٹھنڈ بیں ٹھنڈ بیں ڈھوکیں جا کے تھارے نال کے چار وہے

چوہدری محمد علی، ریاست میں سوشل ویلفیئر آفیسر کے عہدہ پر مامور ہیں۔ شعر و سخن کا مذاق فطری ہے۔ ان کے گوجری گیت رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔
چوہدری حسن الدین حسن پونچھی، بسیار گو شاعر ہیں۔ ان کی ایک طویل نظم "چھوک اللہ تیری" کے عنوان سے "گوجر دیس" میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی سی حرفی بھی مقبول ہے۔
حاجی علیم الدین کٹاریہ، بن باسی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کے حب وطن کے گیت کافی مقبول رہے۔ "اپنو دیس" کے عنوان سے ان کی جو نظم لکھی گئی ہے۔ وہ ان کے جذبات وطن پرستی کی شاہد ہے۔ کہتے ہیں ؎

چپو چپو یاہ زمین مہاری ہے — اس کی ہر ہر رگ مانھ خون رواں مہارو
ہر ہر پھل تے پت مانھ رت بہاری — مالی ہم اس کا یوہ گلستان مہارو

اس میں اپنی قوم کے نوجوانوں میں تعلیم اور تنظیم کے فقدان کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں ؎

بن باسی آج قوم مانھ تعلیم تنظیم تے ہز نہیں
عزت، دولت تے خالی پھرے ہر جوان مہارو

مولوی عبدالغفور عاصی کو گوجری کے موجودہ چوٹی کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے
ان کا وطن نوشہرہ ہے۔ سی حرفیاں جو انہوں نے لکھی ہیں، پایہ کی تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ
اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہی ہیں۔ اسی صف کے شعراء میں غلام احمد رضا، صابر
پھامڑہ، اور اقبال عظیم کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ غلام احمد نے کچھ ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کا
ایک ڈرامہ "مہار وبیر" زبان اور فن دونوں لحاظ سے اچھی تخلیق ہے۔ اس کا ایک باب
"گوجر دیس" میں شائع ہو چکا ہے۔

صابر پھامڑو، ان چند افراد قوم سے ہیں، جنہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے
موقعے مل سکے۔ وہ ایم۔ اے۔ ہیں اور علم و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ غزل
اچھی کہتے ہیں۔ ایک غزل جو "ہوں عشق ماہنہ خاک ہو یو" کے عنوان سے شائع ہوئی
تھی، اس کے تین شعر ہیں :

جد صورت دس کے پار گیو	پہل ہوں ساز وسنسار گیو
ہم جس نال بھولو سمجھاں تھا	اوہ آخر ہم نال چپار گیو
ہوں عشق ماہنہ صابر خاک ہو یو	اوہ جھگڑو تے تکرار گیو

چونی لال شعلہ راجوری کے رہنے والے ہیں، شاعری اور ڈراما سے
دلچسپی ہے۔ ان کا کلام رسایل میں چھپا ہے۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں، جن میں
سے بعض پونچھ میں اسٹیج پر پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان کا مشغلہ تجارت ہے۔ ادب
میں وہ ترقی پسند رجحان کے حامل ہیں۔

اقبال عظیم صاحب ذوق نوجوان ہیں۔ جن کو گوجری ادب کی ترقی، اور گوجر قوم
کی تنظیم کا بڑا احساس ہے۔ اس وقت وہ ریڈیو کشمیر سری نگر میں گوجری نشریات کے
نگراں ہیں۔ ان کا وطن وانگت ہے۔ شاعری اور ادب دونوں سے انہیں دلچسپی ہے۔
فتح علی سردری کسانہ کے تعاون سے انہوں نے "گوجر دیس" سہ ماہی رسالہ جموں سے

جنوری ۱۹۶۵ء سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ جس کے صفحات کے ذریعے گوجر قوم کے مسایل اور گوجری ادب کی تخلیقات منظرِ عام پر آتی رہتی تھیں۔ یہ رسالہ ۱۹۶۸ء کے بعد شائع نہ ہو سکا۔ جموں سے ہفتہ وار اخبار "گوجر" بھی کچھ عرصہ تک شائع ہوا۔ "گوجر دیس" اور ہفتہ وار "گوجر" دونوں اُردو زبان میں شائع ہوتے تھے۔ جن کے ذریعے قوم کی تاریخ اور ادب کے نمونے اور مسایل پیش کئے جاتے تھے۔ اقبال عظیم خوش فکر شاعر بھی ہیں اور نئی تحریکوں کا پورا شعور رکھتے ہیں۔

اس وقت ایک اور نوجوان جاوید احمد نظامی سری نگر سے ایک ہفتہ وار "سری نگر ٹائمز" کے نام سے نکال رہے ہیں۔ اسے دراصل گوجر ہفتہ وار کا جانشین سمجھنا چاہیئے۔ اس کے ذریعے بھی عام مسایل کے ساتھ ساتھ گوجر قوم اور ادب کے مسایل اور کبھی کبھی نمونے بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔

صابر آفاقی جن کا وطن مظفر آباد ہے، اچھے سخن سنج ہیں۔ ان کی نظم جو "اتھروں" کے عنوان سے مرتب اور شائع ہوئی ہے۔ اس کا ذکر ذبیح کے تذکرہ میں کیا جا چکا ہے۔

شاعری اور ڈراما کے علاوہ مکاتیب کا بھی تھوڑا سا ادب گوجری میں پیدا ہوا ہے۔ اس کے نمونے بھی زیادہ تر گوجر دیس یا کچھ اخباروں میں نکل چکے ہیں۔

گوجری میں کچھ رزمیہ نظمیں بھی لکھی گئی تھیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم اب دستیاب ہوتی ہیں جو نظمیں زبان زد اور مقبول تھیں، وہ اب بھی باقی رہ گئی ہیں اور ان کے اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ گوجروں کے ابتدائی زمانے میں ایک مہم پسند اور فوجی قوم ہونے کا لازمی اور فطری تقاضا تھا کہ رزمیہ شاعری سے انہیں دلچسپی ہوتی۔ ایک نظم کے کچھ شعر "گوجر دیس" کے شمارہ جنوری ۱۹۶۵ء میں دیئے گئے ہیں۔ اس وقت قیصر الدین۔ نسیم پونچھی اور بہت سے دوسرے ادیب بھی گوجری کے مطلع پر ابھر آئے ہیں۔

ناشر: سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر۔

مطبع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی۔

چھاپ: ۱۰۰۰۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء

خوشنویس: محمد یوسف مسکین۔ گلزار احمد

قیمت:

انچارج پبلیکیشن:
بشیر اختر